خدا کا لہجہ

اردو کے ممتاز شاعر افتخار عارف کا ایک خوبصورت شعر ہے:

یہ وقت کس کی رعونت پہ خاک ڈال گیا
یہ کون بول رہا تھا خدا کے لہجے میں

یہ شعر بڑی خوبصورتی سے مخلوق کے تکبر کی بے وقعتی کو بیان کرتا ہے۔ ہر بڑائی پسند شخص کا انجام یہی ہوتا ہے کہ وقت اس کی رعونت پر خاک ڈال کر اسے اور اس کی بڑائی دونوں کو مٹی میں ملا دیتا ہے۔ تاہم یہ شعر خدا کے لہجے کی مکمل ترجمانی نہیں کرتا۔ خداوند دو عالم بلاشک و شبہ ہر بڑائی اور کبریائی کا مستحق ہے۔ ہر حمد، ہر تعریف اور ہر شکر اسی کے لیے ہے۔ ہر چیز کا وہی خالق، وہی مالک ہے۔ وہ بڑا ہے اور بلاشبہ ایک حاکم و مالک کے لہجے میں بھی گفتگو کرتا ہے۔

تاہم قرآن مجید کو بغور پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لہجے کی درست ترجمانی یہ ہے کہ وہ مکمل اعتماد اور یقین کے ساتھ کلام کرتا ہے۔ یہ انداز گفتگو کسی ایسی ہستی کے لیے ہی ممکن ہے جو ظاہر و باطن سب کا جاننے والا ہو۔ جو ماضی، حال مستقبل سے یکساں طور پر باخبر ہو۔ جسے معلوم ہو کہ اس کی کہی ہوئی ہر بات پتھر پر لکھی ہوئی تحریر سے زیادہ محکم ہے۔ جسے یقین ہو کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے وہ آخری سچ ہے۔ جو خبر وہ دے رہا ہے وہ ہر حال میں پوری ہوگی۔

اس کی سب سے بڑی مثال کفار کا اپنے زمانے کے رسولوں سے مکالمہ ہے۔ ہر زمانے کے کفار کو رسول ان کے کفر کی پاداش میں دنیا کے عذاب سے خبردار کرتے رہے ہیں اور وہ ان کا مذاق اڑاتے رہے۔ بالآخر عذاب آیا اور کفار کی جڑ کاٹ دی گئی۔ ٹھیک اسی پر اعتماد لہجے میں قرآن انسانیت کو قیامت کے عذاب سے خبردار کرتا ہے، مگر کوئی مان کر نہیں دیتا۔ مگر خدا کا لہجہ یہ بتاتا ہے کہ جلد ہی یہ واقعہ بھی رونما ہو کر رہے گا۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ خدا کے اس پر اعتماد لہجے اور اس کلام کو دنیا تک پہنچائیں تاکہ اللہ کے بندے اس کی گرفت سے بچ سکیں۔

درد کا پیغام

ہم میں سے کوئی شخص نہیں جسے زندگی میں کبھی درد نے تنگ نہ کیا ہو۔ درد ہوتا ہے تو انسان بے چین ہو جاتا ہے۔ زندگی کا لطف غارت ہو جاتا ہے۔ درد سے چھٹکارا پانے کے لیے انسان ہر طرح کے جتن کرتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سے رجوع کرتا ہے۔ مختلف ادویات لیتا ہے۔ جسم کے اس حصے پر مساج اور مالش کرائی جاتی ہے کہ درد سے جان چھوٹ جائے۔

تاہم بہت کم لوگ یہ حقیقت جانتے ہیں کہ درد اللہ تعالیٰ کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ایک ہے۔ یہ درد ہمیں اذیت دینے کے لیے نہیں پیدا کیا گیا بلکہ ہماری حفاظت اور زندگی کو یقینی بنانے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ درد ہی ہے جس کی وجہ سے ہم کوئی فیصلہ کن ضرر پہنچنے سے پہلے نقصان دہ چیز کو خود سے دور کرتے ہیں۔ ہم درد نہ محسوس کریں تو اطمینان سے بیٹھے رہیں گے اور یہ نقصان دہ چیز یا حالات خاموشی سے ہمیں مار ڈالیں گے۔

یہی معاملہ اس دنیا کی ہر اس چیز کا ہے جو بظاہر منفی نوعیت کی ہوتی ہے۔ جس سے بظاہر ہمیں تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ جو ہمیں اپنی زندگی میں بری لگتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اس دنیا میں کوئی منفی چیز بھی بلا وجہ اور بے فائدہ ہرگز نہیں ہے۔ ہاں بعض چیزوں کا فائدہ صرف اس دنیا میں نظر آ جاتا ہے۔ جیسے درد کا فائدہ دنیوی جسم کو پہنچنے والے ضرر کے حوالے سے سمجھا یا جا سکتا ہے۔ مگر اکثر منفی اور تکلیف دہ چیزیں ایسی ہوتی ہیں جن کا حقیقی ضرر اِس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں سامنے آنے والا ہوتا ہے۔ اسے اس دنیا میں براہ راست نہیں سمجھا جا سکتا۔

تاہم درد کی مثال سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ زندگی کی ہر منفی چیز دنیا یا آخرت کے کسی بڑے خیر کو دینے یا بڑے ضرر سے بچانے کے لیے ہوتی ہے۔ چنانچہ ایک مومن ہمیشہ منفی اور تکلیف دہ حالات میں بھی مثبت رہتا ہے۔ وہ منفی چیزوں کو بہتر بنانے کی کوشش کرتا ہے، مگر کبھی مایوس نہیں ہوتا۔ یہی درد کا پیغام ہے۔

محنت اور مقصد

اللہ تعالیٰ نے اس مادی دنیا میں یہ اصول بنایا ہے کہ عام طور پر انسانوں کو ترقی اور کامیابی کے لیے سخت محنت کرنا پڑتی ہے۔تاہم کسی مقصد کے حصول کے لیے محنت کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔انسان طبعاً محنت اور جدوجہد کو پسند نہیں کرتے۔ چنانچہ خارج میں کسی کامیابی کے حصول کے لیے ایک طرف باہر کی دنیا میں زبردست جدوجہد کرنی پڑتی ہےتو دوسری طرف اپنی نفسیات اورطبیعت کےخلاف جانا پڑتا ہے۔

اس مسئلے سے وہ لوگ بچ جاتے ہیں جنھیں بچپن ہی سے سخت محنت اورڈسپلن کی عادت ڈال دی جائے۔تاہم بیشتر لوگوں کو یہ عادت نہیں ڈلوائی جاتی۔جنھیں ہوتی بھی ہے تو بڑے ہونے کے بعد اکثر ان پر بھی تساہل غالب آجاتا ہے۔کسی خاص موقع پر وہ محنت کر بھی لیں تب بھی یہ ان کی مستقبل عادت نہیں رہتی۔

ایسے میں کسی شخص کو محنت پر آمادہ کرنے کا واحد راستہ یہی بچتا ہے کہ ہر شخص اپنے سامنے ایک بلند مقصد رکھے۔ یہ مقصد انسان کا شوق بن جائے۔ یہ مقصد انسان کا مسئلہ بن جائے۔ جب انسان کا مقصد اس کا شوق اور مسئلہ بن جاتا ہےتو پھر اس کے اندر ایک زبردست تحریک پیدا ہوتی ہے۔ یہ تحریک اسے محنت کرنے اور کام کرنے پر مجبور کرتی ہے۔اس وقت انسان آرام و آسائش کے بجائے کام کر کے اپنے مقصد سے قریب ہونے پر سچی خوشی محسوس کرتا ہے۔

بامقصد انسان کبھی بےکار نہیں بیٹھتا۔وہ کبھی وقت ضائع نہیں کرتا۔حتیٰ کہ اس کا آرام اور اس کی تفریح بھی اس لیے ہوتی ہے کہ یہ اس کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے تروتازہ کر دیتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس دنیا میں بڑی کامیابیاں حاصل کرتے ہیں۔ یہی لوگ ترقی اور کامیابی کی دوڑ میں ہمیشہ دوسروں سے آگے رہتے ہیں۔

علمی آمریت

آمریت کی ہر قسم بری ہے، مگر علمی آمریت سب سے بری ہوتی ہے۔

علمی آمریت سے مراد وہ رویہ ہے جس میں ایک شخص آپ کے پاس آتا ہے اور اپنا نقطۂ نظر، اپنا فہم اور اپنی تحقیق آپ پر زبردستی مسلط کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کے نزدیک جو انھوں نے سمجھ لیا وہ حرف آخر ہے اور جو نتیجہ انھوں نے اخذ کرلیا وہ آخری سچائی ہے۔ ان کے نزدیک ان کا فہم اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بات اور ان کی ذات اللہ اور اس کے رسول کی ذات کے مترادف ہوتی ہے۔

ایسے لوگ کچھ ذہین بھی ہوتے ہیں۔ اِدھر اُدھر کا کچھ نہ کچھ مطالعہ بھی کر لیتے ہیں۔ چنانچہ تھوڑی بہت نکتہ آفرینی کی صلاحیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ خود ساختہ نکتوں کو وحی آسمانی کے قائم مقام سمجھتے ہیں۔ لوگوں سے زبردستی اپنی اس ''وحی'' پر ایمان لانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جو لوگ ایمان نہ لائیں، ان کو قرآن مجید کی وہ وعیدیں سنانے لگتے ہیں جو اللہ کے رسولوں کی نافرمانی کی پاداش میں قرآن کریم میں بیان ہوئی ہیں۔

یہ ایک باریک فرق ہے جو اس مزاج کے لوگ نہیں سمجھ پاتے۔ وہ یہ کہ قرآن وسنت میں اگر کوئی حکم بیان ہوا ہے ہے تو اہل علم اپنے اپنے طریقے پر اس کو سمجھ کر اس کا مدعا بیان کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس میں اختلاف ہوسکتا ہے۔ اس کی بہت عام مثال عصر کا وقت ہے۔ ہمارے ہاں ایک گروہ کے نزدیک عصر کا وقت کچھ پہلے ہو جاتا ہے دوسرے کے نزدیک کچھ بعد میں۔ اب ایک گروہ یہ کہے کہ جنھوں نے پہلے عصر پڑھی چونکہ وہ ان کے حساب سے وقت سے پہلے پڑھی تو ساری زندگی ان کی عصر ہی ادا نہیں ہوئی تو یہ رویہ علمی آمریت ہے۔ اہل علم کو دلیل کی بنیاد پر رائے قائم کرنے، اسے بیان کرنے اور اس پر عمل کرنے کا حق حاصل ہے۔ اس حقیقت کو سمجھنا ہی معقولیت ہے۔ اور اس کا انکار علمی آمریت ہے۔

غلاف

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر یہ بات بیان ہوئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کرنے والے کفار اور یہود آپ کی بات کو سننے اور سمجھنے سے ہمیشہ پہلو تہی کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک مقام (البقرہ 86:2) پر یہود کا یہ قول نقل ہوا ہے کہ ہمارے دلوں پر غلاف ہے۔ مطلب یہ کہ ہمارے دل تمھاری بات سننے اور سمجھنے کے لیے بند ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ تبصرہ فرمایا ہے کہ اصل بات یہ ہے کہ ان پر ان کے کفر کی وجہ سے لعنت کی گئی ہے۔ اب یہ کم ہی مانیں گے۔ اس آیت میں کفر سے مراد یہود کا یہ اصولی فیصلہ ہے کہ وہ بنی اسرائیل سے باہر کسی نبی کو نہیں مانیں گے۔ چنانچہ ان کی یہی متعصّبانہ سوچ ان پر لعنت الٰہی کا سبب بنی ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ قرآن کی یہ بات پوری طرح سچ ثابت ہوئی اور اہل مکہ کے برعکس جو بالآخر سب کے سب ایمان لے آئے، یہود میں بہت ہی کم لوگ ایمان لا سکے۔

حقیقت یہ ہے کہ تعصب میں مبتلا انسان اپنے گروہ اور اپنے فرقے سے باہر کبھی کسی سچائی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا۔ وہ ایسی ہر صدا کو دماغ تک پہنچنے سے روکتا ہے چاہے اسے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنی پڑیں یا دلوں پر غلاف چڑھانا پڑے۔ اپنے زمانے کا بڑے سے بڑا آدمی بھی کسی سچائی کو بیان کررہا ہو، ایک متعصب انسان کسی صورت اس کی بات نہیں سنتا۔ یہی نہیں بلکہ ایسے لوگ بڑے فخر سے یہ اعلان کرتے ہیں کہ ان کے دل خارج کی ہر آواز کو سننے کے لیے بند ہیں۔ مگر درحقیقت یہ رویہ اس بات کا عکاس ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں پر اللہ کی لعنت ہوچکی ہے۔

خدا خوفی رکھنے والے ہر انسان کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ہر آن یہ جائزہ لیتا رہے کہ کہیں وہ تعصب کا مریض تو نہیں ہورہا۔ کہیں اس نے کسی سچائی کو محض اس وجہ سے ماننے سے انکار تو نہیں کردیا کہ یہ اس کی مرضی اور تصورات کے خلاف ہے۔ اگر ایسا ہے تو فوراً اپنی اصلاح کرے کیونکہ اس رویہ کا انجام اللہ کی لعنت کے سوا اور کچھ نہیں۔

شیطان کے نام کھلا خط

رات کے اس پہر جب دنیا سو چکی ہے، نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور ہے۔ وجہ یقیناً 16 دسمبر 2014 کے دن معصوم بچوں کے قتل عام کا واقعہ ہے۔ کسی صاحب دل اور صاحب اولاد کے لیے معصوم بچوں کے ایسے بہیمانہ قتل کی یاد، نینداڑانے کے لیے بہت ہے۔ مگر میری اذیت کو بڑھانے والی شے یہ المیہ ہے کہ یہ سب کچھ اللہ رب العزت اور سرکار دوعالم رحمت للعالمین کے نام پر ہوا۔

اس اذیت میں ہمارے جیسے عاجز لوگ صرف اپنے رب ہی سے فریاد کر سکتے ہیں، رات کا یہ پہراس فریاد کے لیے بلا شبہ بہترین وقت ہے۔ مگراس فریاد کے بعد کسی اور کو بھی کچھ بتانے کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ وہ ملعون جو اس پوری صورتحال کا اصل ذمہ دار ہے عالم الغیب نہیں ہے۔ میری مراد شیطان سے ہے۔ یہ فکر، یہ سوچ، یہ منصوبہ اسی ملعون کا ہے جس کی زندگی کا مقصد انسانوں کو جہنم کا ایندھن بنانا ہے۔ اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ دین حق یعنی اسلام سے دنیا کو متنفر کر دیا جائے۔ اوراس کی بہترین حکمت عملی یہ ہے کہ یہود کی طرح مذہب کے نام لیوا مسلمان ہی یہ ''خدمت'' سرانجام دیں۔

پچھلے برس جب یہ واقعہ ہوا تو اس کے بعد میں نے ''آخری جنگ'' لکھنے کا عزم کیا تھا۔ اور اللہ رب العزت کی عنایت سے شیاطین کے سارے منصوبوں اور اللہ کی منشا کو اس کی کتاب قرآن مجید اور اس کے حبیب کی سیرت کی روشنی میں ''آخری جنگ'' میں کھول کر لوگوں کے سامنے رکھ دیا ہے۔ میں اس عنایت پر اپنے رب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ اس نے اس عاجز سے یہ کام لیا۔ فالحمدللہ رب العالمین۔

میں جانتا ہوں کہ شیطان کے لشکر بے شمار اور اس کے حمایتی بے گنتی ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ

دور جدید میں شیطان کے وسائل بے حساب اور عصر حاضر میں اس کی کامیابیاں بے شمار ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ خدا وآخرت سے غافل کروڑوں غیر مسلم شیطان کے سپاہی بن چکے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ لاکھوں قوم پرست اور فرقہ فرست مسلمان اس کی کٹھ پتلیاں بن چکے ہیں۔ مگر اہم بات یہ ہے کہ ان سب کے مقابلے میں تنہا خدا، ایک خدا ہی کافی ہے۔

حسبنا الله و نعم الوکیل۔ نعم المولیٰ و نعم النصیر

اب وقت آ گیا ہے کہ شیطان اور اس کی ذریت یہ جان لے کہ ان کی فتوحات کے دن ختم ہو چکے اور ان کی مہلت کے دن گنے جا چکے ہیں۔ شیطان اور اس کی ذریت اب ہر قدم پر مزاحمت دیکھے گی۔ شیطان اور اس کی ذریت اب ہر برس ایک نئی شکست کھاتی چلی جائے گی۔ وہ ایک داعی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کریں گے تو خدا دوسرا سامنے لے آئے گا۔ وہ ایک داعی سے نمٹنے نہیں پائیں گے تو دوسرا ان کے راستے میں آجائے گا۔ یہ بندگان خدا حق کی گواہی دیں گے اور اس راہ میں کسی مخالفت اور کسی فتنہ انگیزی کی پروا نہیں کریں گے۔ حق کی یہی گواہی وہ چیز ہے جس کے بعد اللہ تعالیٰ کی حجت لوگوں پر پوری ہوتی ہے اور پھر اس کی پکڑ کا اٹل قانون حرکت میں آتا ہے۔

آخرت کی زندگی جنت کی ابدی بستی کی شروعات سے قبل ایک آخری دفعہ اور فیصلہ کن طور پر اس قانون کے حرکت میں آنے کا وقت ہو گیا ہے۔ اب لوگ فیصلہ کر لیں کہ ان کو کیا کرنا ہے۔ اس لیے کہ لوگوں کے ابدی مستقبل کا فیصلہ اب ہو رہا ہے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔ وللہ الحمد۔

بندہ عاجز ابویحییٰ

مکاتیب

ابویحییٰ

غیر مسلموں کو سلام

محترمی ومکرمی حزب اللہ صاحب 25/11/2015

السلام علیکم ورحمت اللہ وبرکاتہ

آپ سے ملاقات باعث مسرت تھی۔ وقت کی تنگی کی بنا پر بعض امور پر گفتگو تشنہ رہ گئی۔ خاص طور پر غیر مسلموں کو سلام نہ کرنے کے حوالے سے موضوع کا علمی احاطہ نہ ہوسکا۔ اس کی تلافی کے لیے چند سطور پیش خدمت ہیں۔

ہمارے ہاں یہ عام نقطۂ نظر ہے کہ غیر مسلموں کو سلام نہیں کیا جائے گا۔ یا کم از کم سلام میں پہل نہیں کی جائے گی۔ اس کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض ارشادات ہیں۔ مثلاً یہ روایت کہ یہود و نصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو۔ اور یہ کہ جب وہ تمھیں سلام کہیں تم جواب میں صرف وعلیکم کہو۔ ایک اور صحیح روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ کو سلام کرنے میں پہل نہ کرو اور جب تم ان کو راستے میں ملو تو ان کو تنگ حصے کی طرف ہو جانے پر مجبور کر دو۔

یہی وہ نقطۂ نظر ہے جو عام طور پر ہمارے ہاں معروف ہے۔ تاہم اس خاکسار کے نزدیک یہ نقطۂ نظر قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض دیگر ارشادات کو نظر انداز کرنے اور ان کو دین کی مجموعی تعلیم کے تناظر میں نہ دیکھنے کی بنا پر رواج پا گیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک دوسری روایت جو بہت کم بیان کی جاتی ہے حالانکہ یہ امام بخاری و مسلم دونوں نے بیان کی ہے وہ ایک دوسری بات بتاتی ہے۔ اس روایت میں حضرت اسامہ بن زید بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم ایک ایسی مجلس سے گزرے جس میں مسلمان، مشرک اور یہود موجود تھے تو آپ نے ان کو سلام کیا۔(بخاری 6207، رقم مسلم رقم 1798)۔

میرے نزدیک اس معاملے کو قرآن مجید کی روشنی میں دیکھنے سے اصل معاملہ بالکل درست طور پر سامنے آجاتا ہے۔ پہلی قسم کی روایات جو نہ صرف یہود و نصاریٰ کو سلام کی ممانعت کرتی ہیں بلکہ انھیں تنگ راستے کی طرف کر دینے کا بیان کرتی ہیں وہ سورہ توبہ کے اس ارشاد باری تعالیٰ کا بیان ہیں جس میں اتمام حجت کے بعد عرب کے یہود و نصاریٰ کی یہ سزا بیان ہوئی ہے کہ وہ سرزمین عرب میں مغلوب کر کے رکھے جائیں گے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

اِن اہل کتاب سے جنگ کرو جو نہ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام ٹھہرائے ہوئے کو حرام ٹھہراتے ہیں اور نہ دین حق کی پیروی کرتے ہیں، یہاں تک کہ وہ مغلوب ہو کر جزیہ ادا کریں اور ماتحت بن کر زندگی بسر کرنے پر راضی ہوں، (التوبہ 29:9)

جیسا کہ قرآن مجید نے بیان کیا یہ ایک سزا ہے جو عرب کے یہود و نصاریٰ پر اتمام حجت کے بعد نافذ کی گئی۔ جس کے بعد حضور کے اس ارشاد کی توجیہ بھی کی جاسکتی ہے کہ چلنے کے راستوں پر بھی مسلمانوں کا حق ان سے زائد ہے اور ان کو تنگ حصوں کی طرف ہو جانے پر مجبور کیا گیا۔ ورنہ مجھے یہ بتایئے کہ سلام نہ کرنا تو پھر غنیمت ہے، راستے کے تنگ حصوں پر مجبور کرنے والی روایت پر آج عمل کریں گے تو اس کے نتائج کیا نکلیں گے اور اسلام کا کیا تصور دنیا کے سامنے آئے گا۔

اسی لیے اس خاکسار کا یہ نقطہ نظر ہے کہ نہ تو یہ دین کی مجموعی تعلیم ہے اور نہ آج کے غیر مسلموں سے اس کا تعلق ہے۔ ان کے متعلق اسوہ حسنہ وہی ہے جو حضرت اسامہ کی روایت میں بیان ہوا اور جو قرآن مجید کے ان ارشادات کے عین مطابق ہے جو خود سلام کے حوالے سے بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت ابراہیم کے متعلق بیان ہوا ہے کہ انھوں نے اپنے مشرک باپ آزر کے

پاس سے رخصت ہوتے ہوئے اسے سلام کیا تھا، (مریم19:47) یا صحابہ کرام کا طریقہ بیان ہوا ہے کہ جاہل جب ان کے منہ کو لگتے تو وہ سلام کہہ کر الگ ہو جاتے، (فرقان63:25)۔ قرآن و حدیث کے یہ واضح ترین ارشادات ہیں جن سے ثابت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سب مشرکین کو سلام کرتے تھے جو بت پرست تھے۔ یہود و نصاریٰ عقیدے میں ان سے تو بہتر ہیں کہ ان کو اہل کتاب کہا گیا اور ان کی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔

یہاں یہ بھی دلچسپ سوال ہے کہ کیوں اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح یعنی محبت اور قرابت کا تعلق تو جائز رکھا گیا ہے، مگر ان کو سلام کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ آدمی ساری زندگی اپنی بیوی کو سلام کرے، نہ اس کے والدین اور اقرباء کو اور پھر یہ توقع رکھے کے وہ اسلام کی دعوت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیں گے۔

بہرحال میرے نزدیک اسلام ایک دعوت ہے۔ یہ دعوت نفرت اور حقارت کے ساتھ نہیں دی جا سکتی۔ اس دعوت کا مطلب ہی جہنم کی آگ سے جنت کی سلامتی کی طرف بلانا ہے۔ یہی سلام کا بھی مطلب ہوتا ہے۔ یہی اسلام کی اصل تعلیم ہے۔ قرآن و حدیث کے جن بیانات سے غلط فہمی ہو جاتی ہے، ان کا موقع محل میں نے واضح کر دیا ہے۔ ان کا آج کے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں۔

والسلام علیکم

بہترین انسان وہ ہے جو مسائل حل کرتا ہے
اور بدترین وہ ہے جو مسائل پیدا کر دیتا ہے (ابویحییٰ)

پروفیسر محمد عقیل

سب سے اچھا موبائل کس کا

موبائل سیٹ آج کل کی دنیا میں سب سے زیادہ پر کشش شے بن چکا ہے۔ ہر شخص گردن جھکائے اسکرین پر انگلیاں پھیرتا نظر آتا ہے۔سیل فون کی خواہش اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ بچے اپنا گردہ بیچ کر بھی اس نایاب نعمت کو حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

سیل فون کے استعمال میں وہ کیا بات ہے کہ دنیا پاگل ہوچکی ہے؟ دراصل دنیا کی آسائشوں کا خلاصہ سیل فون میں موجود ہے۔اس میں کمیونکیشن ، انٹرٹینمنٹ ، خودنمائی، ستائش کا حصول اور مذہبی تعلیمات، سائنسی معلومات سمیت وہ سب کچھ ہے جو انسان تصور کی دنیا میں دیکھنا، سننا اور پڑھنا چاہتا ہے۔اس چھوٹی سی ڈبیا میں ایک پوری دنیا موجود ہے جس کی سیر کرنے سے آنکھیں تو تھک سکتی ہیں لیکن اس دنیا کی رنگینیاں ختم نہیں ہوتیں۔

ہر نیا آنے والا دن سمارٹ فون میں نت نئی تبدیلیاں لا رہا ہے۔ یہ ڈبیا جس کا سفر بٹن والے ایک فٹ لمبے بھدے سیٹ سے ہوا تھا، آج گرگٹ کی طرح رنگ بدلتا ہوا ٹچ اسکرین تک پہنچ گیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ٹچ کی بجائے آواز کے ذریعے اسے کمانڈ دی جائے گی اور عین ممکن ہے کہ ادھر انسان سوچے ادھر موبائل سیٹ ایک سگھڑ بیوی کی طرح بات سمجھ جائے اور حکم کی تعمیل کردے۔

سیل فون کے استعمال کی بنا پر جہاں آسانیاں پیدا ہوئی ہیں وہیں کئی سماجی اور اخلاقی مسائل نے بھی جنم لیا ہے۔اس میں ایک اہم مسئلہ اسراف، دکھاوے اور غیر ضروری مقابلے کے رجحان کا ہے۔ ہر دوسرا شخص مہنگا اور نیا سیٹ لینا چاہتا ہے خواہ اس کی ضرورت ہو یا نہ ہو۔ اکثر لوگ موبائل خریدنے کے بعد اس کے سارے فنکشنز کے بارے میں جانتے تک نہیں لیکن پیسہ پانی کی

طرح بہانے پر مصر ہیں۔ کچھ لوگ محض دوسروں کی دیکھا دیکھی موبائل سیٹ بدلنے کے عادی ہیں کہ چند ماہ بعد ان کے پاس ایک نیا سیٹ ہوتا ہے۔ اس مقابلے میں صرف امیر ہی نہیں بلکہ مڈل کلاس اور غریب لوگ بھی حصہ بقدر جثہ کے مصداق مصروف عمل ہیں۔

جن لوگوں نے اپنی زندگی کا مقصد کھیل تماشا، انٹرٹینمنٹ، دکھاوا اور ہلہ گلہ بنایا ہوا ہے ان سے تو بات کرنا لایعنی ہے۔ البتہ سنجیدہ اور بردبار لوگوں کو اس دکھاوے کی مسابقت میں دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ سنجیدہ لوگوں کا سیل فون کے معاملے میں مقابلہ کرنے کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک وجہ تو بھیڑ چال کی تقلید ہے۔ حالانکہ ہمیں جان لینا چاہئے کہ عوام کی اکثریت سوچے سمجھے بغیر معاملہ کرتی ہے۔ اکثریت کی بنا سوچے سمجھے پیروی گمراہی کی جانب لے جانے والا عمل ہے۔ دوسری وجہ لوگوں کے طعنوں سے بچنا ہے کہ اتنا پرانا سیٹ رکھا ہوا ہے۔ حالانکہ لوگوں کا کام تو نکتہ چینی ہی کرنا ہے خواہ ہم کچھ بھی کرلیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کونسا موبائل سیٹ لیا جائے؟ اس کا جواب اگر دو اور دو چار کی طرح ہوتا تو بات بہت آسان تھی۔ لیکن ہر شخص کی ضروریات مختلف ہیں۔ سب سے پہلے تو ہم اپنی ضروریات کا تعین کریں کہ وہ کونسا موبائل سیٹ ہے جو ہماری انٹرٹینمنٹ، آفس، گھرداری اور سوشلائزیشن کی جائز ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس کے بعد ہم ان ضروریات کے مطابق ایک فون خرید لیں اور اس وقت تک نہ بدلیں جب تک کہ ہمارے پاس اس تبدیلی کی کوئی واضح وجہ ہو۔

سب سے بہترین موبائل سیٹ وہ ہے جو ہماری ضروریات پوری کرتا ہو۔ باقی سارے سیٹ اسراف، نمائش، دکھاوا اور دھوکا ہیں۔ اسراف کا معاملہ یہ ہے کہ یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ یہ ہمارے اطراف پھیلے ہوئے غریب لوگوں کی حق تلفی ہے۔ قرآن میں بیان ہوتا ہے:

اور رشتہ داروں کو (بھی) ان کا حق ادا کرو اور مسکین و مسافر کو (بھی ان کا حق دو) اور فضول خرچی نہ کرو۔ فضول خرچ لوگ شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔ (بنی اسرائیل 17 :26-27)

اسراف کرنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتے اور جس کو اللہ ناپسند کریں تو اس کی دنیا و آخرت برباد ہے:

اے بنی آدم، ہر نماز کے وقت (لباس سے) اپنے تئیں آراستہ کرلیا کرو، اور کھاؤ پیو اور بے جا خرچ نہ کرو۔ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ (الاعراف 7:31)

اسراف پر ناپسندیدگی اس حدیث سے بھی ظاہر ہوتی ہے:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالی تمہاری تین باتوں سے راضی ہوتا ہے اور تین باتوں کو ناپسند کرتا ہے جن باتوں سے راضی ہوتا ہے وہ یہ ہیں کہ تم اس کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کرو اور اللہ کی رسی کو مل کر تھامے رہو اور متفرق نہ ہو اور تم سے جن باتوں کو ناپسند کرتا ہے وہ فضول اور بیہودہ گفتگو اور سوال کی کثرت اور مال کو ضائع کرنا ہیں۔ (صحیح مسلم جلد 2، حدیث نمبر 1987)

ایک اور حدیث مال کے تلف کرنے کو گناہ کا عمل بتاتی ہے:

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا آدمی کو گناہ گار بنا دینے کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ اپنی یا اپنے متعلقین کی روزی کو ضائع کردے۔ (سنن ابوداؤد: جلد اول: حدیث نمبر 1679)

اللہ تعالی ہم سب کو صحیح طرز عمل اختیار کرنے اور اس پر ڈٹ جانے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

ابو یحییٰ

جمہوریت، آمریت، خلافت

انسان اور ریاست: تاریخی پس منظر

ریاست انسان کی ایک اتنی ہی فطری ضرورت ہے جتنی چھت اور گھر انسان کی ضرورت ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ آج زمین پر انسان کا جو غلبہ نظر آتا ہے، ایک زمانے تک صورتحال اس سے بالکل مختلف تھی۔ ہزاروں برس پہلے جب انسان تمدن کے ابتدائی مرحلے میں تھا، اس زمین پر انسان بہت کمزور اور دفاعی پوزیشن میں رہتا تھا۔ فطرت کی طاقتوں اور وحشی جانوروں کی کثیر انواع کے مقابلے میں بنی نوع انسان ایک بہت کمزور جسم کے ساتھ موجود تھا۔ اس کی عقل نے بہت تیر مارا تو لکڑی اور پتھروں کے کچھ اوزار اور ہتھیار بنا لیے، لیکن پھر بھی گوناگوں چیلنجز اسے ہمیشہ خطرے کی زد میں رکھتے تھے۔

چنانچہ انسان کی بہترین دفاعی لائن یہ تھی کہ وہ تن تنہا جینے کے بجائے گروہوں کی شکل میں جیے۔ اللہ تعالیٰ نے جس فطرت اور ساخت پر انسان کو تخلیق کیا اس کی وجہ سے خاندان کی شکل میں ساتھ رہنا ویسے بھی اس کی مجبوری تھی۔ مثلاً یہ حقیقت کہ دوسرے جانداروں کے برعکس انسانی بچہ اپنی پیدائش کے کئی برس بعد بھی اپنی بقا کے لیے ماں باپ کا محتاج رہتا ہے۔ یا پھر انسان کا یہ اخلاقی احساس کہ وہ اپنے کمزور متعلقین خاص کر والدین کی ذمہ داری کو ان کی موت تک ترک نہیں کرتے۔ چنانچہ پہلے کئی خاندان اور پھر قبائل کی شکل میں لوگ جیتے بستے رہے تاکہ یہ اجتماعیت ان کی کمزوری کا مداوا بن جائے۔

تاہم یہ بھی انسانی طبیعت ہے کہ لوگ جب ساتھ رہتے ہیں تو ان میں آپس میں جھگڑا

شروع ہوجاتا ہے۔ یہیں سے یہ ضرورت بھی پیدا ہوئی کہ باہمی تنازعات کو طے کرنے کے لیے اور لوگوں کو ایک دوسرے کے ظلم سے بچانے کے لیے کوئی ایسا فریق ہو جو جھگڑے نمٹا سکے۔ یہیں سے قبائلی سرداروں کا تصور ابھرنا شروع ہوا جو لوگوں کے باہمی جھگڑے نمٹانے کے ساتھ خارجی خطرات کی صورت میں بھی ان کی رہنمائی کرتے۔ یہ سردار عام طور پر قبیلے کا کوئی بزرگ ہوتا یا پھر کوئی طاقتور شخص جس کی طاقت اور صلاحیت کے سب معترف ہوتے۔ اس طرح کے طاقتور سرداروں کی زندگی میں ان کی اولادیں بھی نمایاں ہوجاتی تھیں۔ چنانچہ عام طور پر سردار کے بعد اس کا بیٹا ہی سردار بن جاتا۔ بعض اوقات کسی سردار کی اچانک موت، کسی دوسرے زیادہ حوصلہ مند شخص کی موجودگی یا پھر دیگر خاندانی عصبیتوں کی بنا پر کوئی شخص سردار بن جایا کرتا لیکن عام حالات میں باپ کے بعد بیٹے کی سرداری ایک معروف رواج بن گیا۔ کیونکہ لوگوں کے تعصّبات ایک خاص شخص کے ساتھ وابستہ ہوچکے ہوتے تھے۔ چنانچہ عصبیت کے پہلو سے اس کے بیٹے کو بھی اپنے سردار کے طور پر قبول کرنا ان کے لیے زیادہ آسان تھا۔

ریاست اور خاندانی آمریت

تمدن کے ارتقا کے ساتھ انسان نے بڑی بڑی بستیاں آباد کرنا شروع کیں۔ قصبے اور شہر وجود میں آئے۔ نسلیں اور قومیں بننا شروع ہوئیں جو صدیوں ایک ہی جگہ آباد رہتیں۔ چنانچہ نسلی اور جغرافیائی وحدتیں وجود میں آنے لگیں۔ ان میں متعدد سردار اپنے اپنے قبائل یا گروہوں کی قیادت کرتے اور کسی اجتماعی مسئلے کی شکل میں مل بیٹھ کر تنازعات اور مسائل کو حل کرنے کی کوشش بھی کیا کرتے تھے۔

تاہم اس تاریخی عمل میں کبھی کبھی کسی قبیلے میں کوئی اولوالعزم اور غیر معمولی شخص پیدا ہوجاتا۔ یہ حوصلہ مند فرد اپنی کرشمہ ساز شخصیت، جرات و عزیمت، تنظیمی صلاحیت اور لوگوں کو متاثر کرنے

کی استعداد کی بنیاد پر مختلف الخیال لوگوں کا رہنما بن جاتا۔اور رفتہ رفتہ اپنی طاقت بڑھاتے ہوئے دیگر قبائل کو شکست دے کر یا اپنے ساتھ ملا کر ایک وسیع حکمرانی قائم کر لیتا۔ یوں اس جغرافیائی یا نسلی وحدت میں ایک منظّم اور با قاعدہ ریاست وجود میں آجاتی۔اس کی ایک نمایاں مثال چنگیز خان کی ہے جو ایک چھوٹے سے قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا،مگر اپنی غیر معمولی صلاحیت کی بنا پر اس نے منگولیا کے مختلف قبائل کو ساتھ ملا کر ایک منظّم ریاست قائم کی جس نے آنے والے دنوں میں پوری دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔

ایسے کسی حکمران کی طاقت محض ذاتی طاقت نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کا قبیلہ،اس کے جنگجو اور اس کے حلیف بھی پوری طرح اس کے ساتھ ہوتے اور اس نظام سے مستفید ہوتے تھے۔ چنانچہ حلیف اور رفقا اپنے مفاد کے تسلسل کے لیے اس کی وفات کے بعد اس کی اولاد یا متعلقین میں سے کسی کو اپنا حکمران تسلیم کر لیتے۔مفاد اور عصبیت کے علاوہ اس کا ایک اور اہم سبب یہ تھا کہ یہ طریقہ پر امن بھی تھا۔ ورنہ ہر دفعہ حصول اقتدار کی جنگ میں بہت کشت وخون ہوتا۔خاندانی بادشاہت ان تمام وجوہات کی بنا پر قیادت کی تبدیلی کا ایک بہترین ذریعہ تھی۔یوں قدیم دنیا میں بادشاہت کا ادارہ اقتدار کا پہلا اور سب سے عام ذریعہ رہا۔

نظریاتی آمریت

آمریت کی ایک دوسری شکل بھی دنیا نے تمدن کے ارتقا کے ساتھ ساتھ دیکھی ہے۔اس کا پس منظر یہ ہے کہ چونکہ کسی قائم شدہ بادشاہت کو ہٹانا آسان نہیں ہوتا۔ایسی کوشش کرنے والے بالعموم قتل کر دیے جاتے تھے۔اس لیے لوگوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے بعض اولوالعزم لوگ نظریات کا استعمال کرتے تھے۔مثلاً اسلامی تاریخ سے واقف لوگ یہ جانتے ہیں کہ جس وقت بنوامیہ کے خلاف بنوعباس نے اپنی مہم شروع کی تو انھوں نے قرابت رسول اور اہل بیت کا نام

بھر پور طریقے سے استعمال کیا۔ برسر تنبیہہ یہاں یہ بھی ذہن میں رہے کہ خراسان کے حوالے سے جن ضعیف اور موضوع روایات کی بنیاد پر اس وقت پاکستان اور افغانستان میں جو فساد برپا ہے وہ عباسی تحریک ہی کے زمانے میں وجود میں آئیں۔ بات صرف یہ تھی کہ عباسی تحریک کے سب سے بڑے داعی اور نقیب ابومسلم خراسانی نے عباسی بغاوت کا آغاز خراسان سے کیا تھا جو کہ خلافت بنوامیہ کا مشرقی صوبہ تھا۔ اسی ابومسلم نے ضعیف الاعتقاد نومسلم عجمیوں کی قوت کو بنو امیہ کے خلاف منظّم کیا۔ خراسان اس کا مرکز تھا۔ کالے جھنڈے اور کالے عمامے عباسیوں کے نشان تھے۔ اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم یہ بات جانتا ہے۔ یہی کالے جھنڈوں اور خراسان سے اٹھنے والے لشکروں کی کل حقیقت ہے۔ یہ بنوامیہ کے خلاف عباسیوں اور علویوں (سیدنا علیؓ کی اولاد اور نام لیواؤں) کے متحدہ محاذ کی نظریاتی جنگ تھی تاکہ اپنی جنگ کو مقدس بنا کر عوامی تائید حاصل کی جا سکے۔ انہوں نے یہ تائید اور اقتدار حاصل کر بھی لیا۔ مگر نجانے اس خراسان اور کالے جھنڈوں کے پیچھے اور کتنی تباہی ہمیں دیکھنا ہوگی۔ خیال رہے کہ اُس وقت موجود ائمہ اہل بیت اِس فساد کی حقیقت کو سمجھتے تھے اور اس لیے وہ اس سے بالکل دور رہے۔ اس کا فائدہ اٹھا کر عباسیوں نے ان کے نام پر بنوامیہ سے جنگ تو کی مگر آخر کار علویوں کو کونے میں کر کے اقتدار پر خود قبضہ جما لیا۔

بہرحال عباسیوں، علویوں اور خاص کر ابومسلم خراسانی نے عربوں کے خلاف عجمیوں کی طاقت کو استعمال کرنے کے لیے بھر پور طریقے سے نظریات کا استعمال کیا۔ کالے عمامے، کالے جھنڈے، اہل بیت اطہار اور قرابت رسول کے مقدس ناموں کا زبردست استعمال ہوا۔ یوں ان نظریات کے سہارے دنیا کی سب سے طاقت ور بادشاہت بنوامیہ اپنے عین عالم شباب میں ختم کر دی گئی۔ تقدس کا یہ ہالہ اتنا مضبوط تھا کہ بنوعباس کی سیاسی قوت تو دوصدی ہی میں ختم ہو گئی

لیکن قرابت رسول کے تقدس کی بنیاد پر خلافت بنوعباس پانچ صدیوں تک قائم رہی۔ یہاں تک کہ ایک غیر مسلم حملہ آور ہلاکو خان نے اس کو ختم کر دیا۔

بہر حال خلاصہ یہ کہ سماج اور ریاست میں بادشاہت اور خاندانی آمریت کے بعد اقتدار کی دوسری بنیاد نظریاتی آمریت کو حاصل رہی ہے۔ اس طریقے میں فرد کی ذاتی صلاحیت اور استعداد کے ساتھ ساتھ یا اس سے بڑھ کر ایک نظریہ کچھ ہم خیال لوگوں کو حصول اقتدار کی جدوجہد پر ابھارتا ہے۔ یوں ایک نظریاتی پارٹی یا گروہ وجود میں آتا ہے۔ بعض اوقات اقتدار پر اس گروہ کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ یوں ایک فرد کے بجائے ایک پورا نظریاتی گروہ کسی معاشرے کو اپنا یرغمال بنا کر اپنا غلبہ و اقتدار قائم کر لیتا ہے۔ قدیم دور میں یہ نظریاتی پارٹی بھی بادشاہت کا روپ دھار لیتی تھی البتہ دور جدید میں فرد کے بجائے پارٹی یا گروہ کی آمریت کا چلن عام ہوا۔ اس کی ایک نمایاں مثال کمیونسٹ تحریک ہے جس کے اقتدار نے ستر برس تک نصف دنیا کو اپنے شکنجے میں جکڑے رکھا۔

یہ دونوں شکلیں بظاہر مختلف ہیں، مگر ان میں جو چیز مشترک ہے وہ یہ ہے کہ عوام کی مرضی و منشا کے بغیر بادشاہت اور آمریت عوام پر مسلط ہو جاتی ہے۔ ان میں کوئی اچھی بات ہوتی ہے تو لوگوں کو اس کا فیض ملتا ہے اور ان کا جو شر ہے وہ بہر حال عوام کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔

آسمانی جمہوریت

بعض لوگوں کو یہ تعبیر شاید کچھ اجنبی لگے لیکن یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں ایک دور ایسا گزرا ہے جب آسمان سے زمین کے حکمران کے براہ راست فیصلے نازل ہوتے اور لوگ خوش دلی سے ان فیصلوں کو قبول کر کے اپنی ریاست چلاتے تھے۔ قدیم صحیفوں میں اس کو خدا کی بادشاہی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ہم نے اس ترکیب کو ذرا وسیع کرتے ہوئے 'خدا کی بادشاہی' کے لیے آسمان کا

استعارہ لیا ہے اور جمہوریت سے مراد یہ ہے کہ یہ کسی قسم کا جبر نہیں تھا بلکہ لوگ اپنی مرضی سے انبیا کی بات مانتے تھے۔ اور یہ اختیار بھی رکھتے تھے کہ ان فیصلوں کو قبول نہ کریں۔ اس کو ہم نے آسمانی جمہوریت سے تعبیر کیا ہے۔ اس میں حکمران اللہ کی منشا اور عوام کی فلاح کو اپنی ہر ذاتی غرض سے بلند رکھتے اور معاشرے میں عدل وانصاف کا علم بلند رکھتے۔

دنیا میں اس کی سب سے قدیم مثال وہ تھی جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے سے قائم کی۔ اللہ تعالیٰ مختلف قوموں میں اپنے رسولوں کو بھیجتے رہے ہیں۔ یہ لوگ پرامن طور پر لوگوں کو اپنی دعوت پیش کرتے۔ کچھ لوگ یہ دعوت مان لیتے اور کچھ رد کر دیتے۔ جس کے بعد ماننے والے اپنی مرضی اور خوشی سے اپنے رسول کو اپنا حکمران بھی تسلیم کر لیتے۔ باقی قوم کو ہلاک کر دیا جاتا اور پھر یہ علاقہ اللہ تعالیٰ ان بچے ہوئے لوگوں کو دے دیتے جہاں اللہ کے رسولوں کی قیادت میں یہ لوگ حقیقی اسلامی معاشرے قائم کرتے۔ معلوم تاریخ میں اس کی سب سے قدیم مثال وہ ہے جو بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ سے شروع ہوئی اور کئی صدیوں تک طالوت بادشاہ کے ظہور تک جاری رہی۔ یہ دور قاضیوں اور انبیاء کا دور کہلاتا ہے جس میں ریاست میں کوئی بادشاہ یا آمر نہیں ہوتا تھا بلکہ عوام کے جھگڑے اور جنگ وامن کے معاملات انبیاء اور قاضی چلایا کرتے تھے۔

اس کے بعد بنی اسرائیل نے ایک انحراف کیا۔ انہوں نے اللہ کی پسند کے قانون کے بجائے عام دنیوی اصولوں کے مطابق اپنے لیے بادشاہی نظام چاہا۔ ان کے نبی سیموئل علیہ السلام نے ان کو بہت سمجھایا۔ مگر وہ باز نہ آئے۔ چنانچہ ان کی فرمائش پر طالوت کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کر دیا گیا۔ جس کے بعد حضرت داؤد اور حضرت سلیمان جیسے جلیل القدر انبیا بادشاہ بنے۔ لیکن بنی اسرائیل اللہ کی پسند کے نظام کو چھوڑ کر ایک غلط قدم اٹھا چکے تھے۔ کیونکہ بادشاہی

نظام اپنی نوعیت کے لحاظ سے جابرانہ نظام ہے جس میں بادشاہ اپنی من مانی کرتا ہے اور اچھے خاصے فساد کے بغیر بادشاہ کو ہٹایا نہیں جاسکتا۔ چنانچہ پیغمبروں کے اس منصب سے ہٹنے کے ساتھ ہی اس نظام کی خامیاں پوری طرح ظاہر ہوگئیں اور بنی اسرائیل آمریت کے شکنجے تلے جکڑے گئے۔

انبیا علیہم السلام اور بنی اسرائیل کے قاضیوں کا نظام دنیا کا پہلا جمہوری نظام تھا۔ اس میں عوام اپنی مرضی سے اللہ کی مرضی اپنے اوپر نافذ کرتے ہیں۔ کوئی زبردستی ان پر اسلام نافذ نہیں کرتا۔ یہ نظام اپنی روح میں اتنا زیادہ جمہوری تھا کہ جب لوگوں نے اللہ کی مرضی کے خلاف ایک شخص کو بادشاہ مقرر کرکے اس نظام کی بساط لپیٹنی چاہی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں اس کی بھی اجازت دے دی۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ انسانی اختیار کے مقابلے میں اپنی مرضی بالجبر نافذ نہیں کرتے۔ عوام اپنی مرضی سے اللہ کی مرضی اپنے اوپر نافذ کرتے ہیں۔ تاہم نافرمانی کی سزا دینا اور اطاعت پر عطا کرنا ان کا حق ہے اور یہ کام وہ بہرحال کرتے رہتے ہیں۔

اس کی ایک دوسری شکل وہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافت راشدہ میں ظاہر ہوئی۔ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کیا اور اپنی خوشی سے آپ کو اپنا حکمران تسلیم کرلیا۔ تاہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری نبی اور رسول تھے اور آپ کے بعد آسمان سے وحی اترنے کا سلسلہ بند ہوگیا اس لیے آپ کے بعد کسی کو آسمان سے حکومت کے لیے نامزد کرنے کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ خلافت راشدہ میں خلفائے راشدین کو لوگوں نے اپنی مرضی سے اپنا حکمران منتخب کیا۔

خلفائے راشدین کا انتخاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت عرب سیاسی طور پر ایک منظّم ریاست کے

بجائے ایک قبائلی نظام کے دور میں تھا۔قریش کعبہ کے متولی بھی تھے اور اس کی وجہ سے عرب میں سیادت و قیادت کا جتنا کچھ تصور تھا، اس کے لحاظ سے وہی عرب کے رہنما تھے۔اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان کیا کہ لوگ اس معاملے میں قریش کے تابع ہیں،عرب کے مسلمان قریشی مسلمانوں کے تابع ہیں اور کفارِ عرب کفارِ قریش کے پیرو ہیں،(بخاری رقم، 3495)۔اسی بنا پر آپ نے واضح کر دیا تھا کہ آپ کے بعد اقتدار قریش ہی میں رہے گا(بخاری رقم،7139)۔آپ کے ذہن میں وہ قریشی شخصیت بھی بالکل واضح تھی جسے آپ کی رائے میں مسلمانوں کا حکمران بننا چاہیے تھا،مگر آپ اسے نامزد کر دیتے تو پھر حکمران کی نامزدگی کا طریقہ ہی تا قیامت دین قرار پا جاتا اور لوگوں کی رائے کی کوئی اہمیت نہ رہتی۔ چنانچہ حضور نے اپنی وفات سے پانچ دن قبل مسجدِ نبوی میں ایک آخری خطبہ دیا۔اس خطبے میں آپ نے اُس شخص کی طرف اشارہ کر دیا جو آپ کی نظر میں اس منصب کا سب سے بڑھ کر اہل تھا۔چنانچہ اس موقع پر آپ نے دین اور اپنی رفاقت کے حوالے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خدمات گنوائیں اور حکم دیا کہ مسجد نبوی میں ان کے دروازے کے سوا ہر دروازہ بند کر دیا جائے(متفق علیہ)۔اگلے دن سے اپنی جگہ حضرت ابوبکر کو مسجد نبوی کی امامت سونپ کر اپنا منشا لوگوں پر مزید واضح کر دیا(متفق علیہ)۔ تاہم براہ راست لوگوں سے اس حوالے سے کوئی بات نہ کی۔یہی ایک حقیقت اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ لوگوں پر بالجبر کسی شخص کو حکمران بنانا دین کی منشا کے بالکل خلاف ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد بعض انصاری سقیفہ بنو ساعدہ میں اکھٹے ہو کر انصار کی حکومت کی بات کرنے لگے۔یہ وہ وقت تھا کہ ابھی حضور کی تدفین بھی نہیں ہوئی تھی۔یہ صورتحال ایک خوفناک فساد کو جنم دے سکتی تھی۔ چنانچہ قبل اس کے کہ کوئی فتنہ برپا ہوتا حضرت

عمر حضرت ابوبکر کو لے کر انصار کے پاس پہنچے۔ حضرت ابوبکر اور عمر نے مل کر صورتحال کو سنبھالا۔ حضرت عمر کی بصیرت نے یہ جان لیا تھا کہ اس مجلس میں خلیفہ کا فیصلہ نہ ہوا تو یہ آگ دوبارہ بھڑک اٹھے گی۔ چنانچہ آپ نے دوران گفتگو حضرت ابوبکر کی بیعت کر لی۔ جس پر وہاں موجود تمام مہاجرین و انصار نے آپ کی بیعت کر لی۔ بعد میں تمام مسلمانوں نے آپ کی بیعت کر لی۔ اس کی وجہ بالکل واضح تھی جو حضرت عمر نے اُس تقریر میں کھول بھی دی جس کا ذکر آگے آرہا ہے کہ حضرت ابوبکر جیسا کوئی دوسرا اس وقت موجود ہی نہیں تھا۔ ان کی موجودگی میں کسی دوسرے شخص کے انتخاب کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

بخاری (رقم، 6830) کے مطابق حضرت عمر نے یہ پوری بات مسجد نبوی میں ایک خطبہ دیتے ہوئے اُس وقت بیان کی جب زندگی کے آخری حج کے موقع پر آپ نے یہ سنا کہ کوئی شخص یہ ارادہ کر رہا ہے کہ آپ کے انتقال کے بعد وہ فلاں صحابی کی بیعت کر لے اور یوں ان کی خلافت منعقد ہو جائے گی جیسا کہ حضرت ابوبکر کی منعقد ہوئی تھی۔ چنانچہ اسی تقریر میں آپ نے واضح کر دیا کہ تمام مسلمانوں کے مشورے کے بغیر کوئی کسی سے بیعت نہ کرے ورنہ بیعت لینے اور کرنے والے دونوں کو فساد فی الارض کے جرم میں قتل کر دیا جائے گا۔

خلفائے راشدین میں سے یہی وہ انتخاب ہے جس سے کسی کو کوئی غلط فہمی ہو سکتی تھی۔ باقی خلفاء کا انتخاب تو بالکل واضح ہے کہ عوام ہی نے کیا تھا۔ حضرت عمر کا انتخابی مرحلہ حضرت ابوبکر نے اپنی زندگی ہی میں طے کرا دیا تھا۔ ان کے بارے میں ہر شخص سے رائے لی گئی اور سب نے ان پر اعتماد کا اظہار کیا تھا۔ اس کی نوعیت بالکل ایسی ہی تھی جیسے پاکستان کے وزیر اعظم کا انتقال ہونے لگے تو وہ اپنی زندگی ہی میں حکمران پارلیمانی پارٹی کے مشورے سے ایک شخص پر اتفاق رائے کرا دے۔ مہاجرین قریش کی حیثیت اُس مسلم معاشرے میں یہی تھی۔ ان کی لیڈر شپ

مسلمہ تھی جس کو سب لوگوں کی تائید حاصل تھی۔

حضرت عمر کے بعد یہی معاملہ حضرت عثمان کا ہوا تاہم اس دفعہ لوگوں کے سامنے ایک کے بجائے چھ افراد کو پیش کیا گیا۔ حضرت عمر زخمی تھے اس لیے اپنے سامنے اس عمل کو پورا ہوتا نہ دیکھ سکے۔ گرچہ قرائن یہی ہیں کہ ان کی رائے میں یہ منصب حضرت علی کو ملنا چاہیے تھا۔

یہ راقم کی رائے ہے جو غلط ہو سکتی ہے کہ اس زمانے کے لوگ بھی حضرت علی کو حضرت عمر ہی کا تسلسل سمجھتے تھے اور نئی نسل اب ذرا نسبتاً ایک نرم حکمران چاہتی تھی۔ چنانچہ انھوں نے حضرت علی کے بجائے حضرت عثمان کا انتخاب کر لیا۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد حضرت علی کی بیعت بھی عام لوگوں نے اپنی مرضی سے کی۔ جنھوں نے بیعت نہیں کی ان کو بھی کوئی اعتراض ان کی شخصیت پر نہیں تھا، اعتراض صرف یہ تھا کہ پہلے حضرت عثمان کا قصاص لیا جائے، بیعت وہ بعد میں کریں گے۔

اس تفصیل سے یہ بات ظاہر ہے کہ خلفائے راشدین کا انتخاب لوگوں نے کیا، وہ زبردستی لوگوں کے اوپر مسلط نہیں ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا خاندانی یا نظریاتی آمریت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی بنا پر ہم نے اس خلافت کو بادشاہت یا نظریاتی آمریت کے خانے میں نہیں رکھا بلکہ آسمانی جمہوریت کے ذیل میں رکھا ہے۔ تاہم بدقسمتی سے بنی اسرائیل کی طرح مسلمانوں نے بھی اس آسمانی جمہوریت کو گنوا دیا اور بادشاہت اور آمریت کے جال میں پھنس گئے۔ اور خلافت کے نام پر مسلمان چودہ صدیوں تک بنوامیہ، بنوعباس اور عثمانی خاندانی بادشاہتوں کو سہتے رہے۔

مغربی جمہوریت

آسمانی جمہوریت کا یہی وہ تصور تھا جس نے دنیا کو پہلی دفعہ اس حقیقت سے روشناس کرایا

کہ بادشاہت یا آمریت کے علاوہ یہ ممکن ہے کہ لوگ اپنی مرضی سے اپنے حکمران کا انتخاب کریں۔ چنانچہ قدیم یونان ہو یا جدید مغرب، ہمارے نزدیک یہ جمہوریت کے اصلی ماڈل نہیں بلکہ اس آسمانی جمہوریت کی نقل ہیں جو دنیا کو اللہ تعالیٰ نے عطا کی اور جس میں انسان پر انسان زبردستی مسلط نہیں ہوتے تھے۔ اس مغربی نظام میں یقیناً بڑی کمزوریاں ہیں۔ خاص کر ہمارے ہاں تو جمہوریت کے نام پر وہی مذاق ہورہا ہے جو اسلام کے نام فرقہ واریت اور انتہا پسندی کا زہر پلا کر ہمارے ساتھ کیا گیا تھا۔ اس پر ہم کسی اور وقت بات کریں گے۔ تاہم جیسا کہ ہم نے عرض کیا کہ اب آسمان سے حکمران کا فیصلہ نازل نہیں ہوسکتا۔ ہمیں تین نظام ہائے سیاست میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہے۔ یعنی بادشاہت، آمریت اور جمہوریت۔ باشاہی جبر اور آمرانہ سوچ کے مقابلے میں جمہوری نظام بلاشبہ اللہ کی ایک نعمت ہے جو سب سے پہلے اسی نے اپنے بندوں کو عطا کی۔ چنانچہ ہمارے نزدیک جمہوریت ہی وہ تصور ہے جو اب مسلمانوں کے لیے بہترین انتخاب ہے۔

جمہوریت اور خلافت

اس موقع پر دو غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا ضروری ہے۔ ایک کا تعلق سماجیات کے غلط فہم سے ہے اور دوسرے کا دین کے غلط فہم سے۔ پہلی غلط فہمی غلط تقابل پر مبنی ہے جس میں خلافت کو جمہوریت کے بالمقابل ایک نظام کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خلافت اور جمہوریت اپنی نوع کے لحاظ سے دو جدا تصورات ہیں جو بالمقابل نہیں ہوسکتے۔ اسی غلط فہمی کو واضح کرنے کو ہمیں پچھلے صفحات میں سماج اور ریاست کے ارتقا اور حکمرانی کی مختلف شکلوں کو تفصیل سے زیر بحث لانا پڑا ہے۔

مذکورہ بالا تمام تفصیلات سے یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ جمہوریت کا اگر کوئی تقابل ہوسکتا

ہے تو وہ بادشاہت اور آمریت ہے نہ کہ خلافت۔ یہ تینوں نظام دراصل ایک ہی سوال کا جواب دیتے ہیں۔ وہ یہ کہ وہ کیا بنیاد ہے جس پر کسی شخص کو ریاست کا حکمران بنایا جائے گا۔ بادشاہت کا جواب ہے کہ بادشاہ کا بیٹا بادشاہ بنے گا۔ آمریت کا جواب ہے کہ جو زیادہ طاقت ور ہوگا وہ جبراً اقتدار پر قبضہ کرلے گا۔ جمہوریت کا جواب یہ ہے کہ جس کا انتخاب عوام الناس کریں گے وہی حکمران بنے گا۔

اس کے برعکس خلافت ایسے کسی سوال کا جواب نہیں ہے۔ بلکہ مسلمانوں کی چودہ سو برس کی خلافت کی تاریخ میں تینوں طریقے ملتے ہیں۔ خلافت راشدہ میں اُس دور میں جو عوامی رائے عامہ کو جاننے کا کو ممکنہ طریقہ تھا اس کے مطابق عوام کی مرضی کے عین مطابق یعنی جمہوری طریقے پر خلفائے راشدین کا انتخاب کیا گیا۔ جبکہ ان کے بعد ہمیں زبردستی اقتدار پر قبضہ کرنے والے لوگ بھی نظر آتے ہیں اور خاندانی بادشاہتیں بھی نظر آتی ہیں۔

اسی پس منظر میں ہم جمہوریت کے مخالفین سے یہ سوال دریافت کریں گے کہ وہ اپنے لیے اقتدر میں آنے کا کیا راستہ تجویز کرتے ہیں۔ وہ یقیناً عوام کی تائید سے اقتدار میں آنے کی بات تو کرنہیں سکتے۔ کیونکہ یہی جمہوریت ہے اور یہ ان کے نزدیک کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے حق میں وحی اتاریں اس کا بھی کوئی امکان اب باقی نہیں رہا ہے۔ اس لیے یہ دروازہ بھی بند ہو چکا ہے۔ اب لے دے کر ایک ہی راستہ بچتا ہے اور وہ یہ کہ طاقت کے زور پر اقتدار پر قبضہ کرلیا جائے اور پھر بزورقوت لوگوں پر اپنا خودساختہ فہمِ اسلام نافذ کردیا جائے۔ یہی وہ راستہ ہے جسے خلافت کے سارے موئدین پیش کرتے ہیں۔ یہ کرنا ہے تو ضرور کیجیے۔ مگر اس حقیقت کو جان لیجیے کہ اسے آمریت کہتے ہیں۔ اسے استبداد کہتے ہیں۔ اسے ظلم کہتے ہیں۔

اس موقع پر ہم قرآن مجید کی آیات اس لیے نقل نہیں کریں گے کہ تیرہ سو برس آمریت کے

سائے میں پلنے کے بعد ہم ان آیات کے مدعا کو ماننے پر اب شاید تیار نہیں۔ لیکن یہ بتانا ہماری ذمہ داری ہے کہ یہ نظریاتی آمریت وہ طریقہ ہے جسے اختیار کر کے کمیونسٹوں نے تمام وسط ایشیا کے مسلمانوں کو زبردستی کمیونزم کے شکنجے میں جکڑ دیا تھا۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر کمال اتاترک نے ترکی کے مسلمانوں پر زبردستی سیکولرازم کو مسلط کیا تھا۔ کیا اس کے بعد ہمیں اس راستے کی شناعت اور غلط ہونے پر مزید کوئی تقریر کرنے کی ضرورت ہے؟

جو لوگ اس راستے کو درست سمجھتے ہیں وہ دراصل پاکستان کی ہر اقلیت کو یہ اخلاقی جواز دے رہے ہیں کہ جس کو وہ حق سمجھتے ہیں، کسی بھی طرح اقتدار پر قبضہ کر کے اسے نافذ کر دیں۔ آپ نے اگر اپنے آپ کو یہ حق دے دیا ہے تو دوسرے لوگوں کو یہ حق خود بخود مل چکا ہے۔ پاکستان جیسے معاشرے میں جہاں مختلف فرقوں کے لوگ بڑی تعداد میں پائے جاتے ہیں ایسے کسی راستے کے جواز کی باتیں کرنا ایک خوفناک قسم کے فساد کو جنم دینے کے مترادف ہے۔

جمہوریت کا نظام کفر ہونا

ایک دوسری غلط فہمی جس کا تعلق دین کے غلط فہم سے ہے اور جس کی بنا پر جمہوریت کو بے دریغ کفر کہا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ جمہوریت میں قانون سازی کی آخری اور فیصلہ کن اتھارٹی چونکہ عوام کو حاصل ہے، اس لیے یہ نظام سرتاسر کفر و شرک پر مبنی ہے۔

ہمارے نزدیک یہ غلط فہمی قرآن مجید، اس کی دعوت اور اس کے پیغام کو مکمل طور پر نظر انداز کرنے کی بنا پر پیدا ہوتی ہے۔ قرآن مجید اس معاملے میں آخری درجے میں واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا انسانوں کے امتحان کے لیے پیدا کی ہے۔ اس امتحان میں اللہ تعالیٰ نے یہ حق انسانوں کو مکمل طور پر دے رکھا ہے کہ وہ چاہیں تو ایمان لائیں چاہیں تو کفر کریں۔ چاہیں تو عمل صالح کی زندگی گزاریں اور چاہیں تو فسق و فجور کو اپنا معمول بنائیں۔

یہ بات ضرور ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی بات ، اپنی مرضی اور اپنی منشا پوری طرح واضح کرتے ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ نہ ماننے کہ نتائج کیا نکلیں گے۔ یہ بتاتے ہیں کہ ماننے والوں پر خدا کی رحمت کیسے برسے گی۔ مگر لوگوں کو زبردستی مسلمان بنایا جائے ،لوگوں سے اچھے کام زبردستی کرائے جائیں یہ اللہ تعالیٰ کی اسکیم کا سرے سے حصہ ہی نہیں۔ جس جنت کا وعدہ وہ لوگوں سے کرتے ہیں اس کی ساری قدر و قیمت ہی یہی ہے کہ لوگ اپنی مرضی سے اللہ کے سامنے سر جھکائیں اور جس جہنم کی وعیدیں سنائی گئی ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگ جانتے بوجھتے اور سمجھائے جانے کے باوجود ظلم وعصیان کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جبر کسی پہلو سے اس اسکیم کا حصہ نہیں۔

یہ بات اگر واضح ہے تو اس کے بعد جمہوریت کے کفر والی بات کے غبارے سے ساری ہوا نکل جاتی ہے۔ جمہوریت انسانوں کو وہی اختیار دیتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے۔ اچھے یا برے حکمرانوں کو منتخب کرنے کا اختیار۔ شریعت کے مقدس قانون کو قبول کرنے یا اسے جان بوجھ کر رد کرنے کا اختیار۔ اسلام کو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا حصہ بنانے کا اختیار یا اسے رد کرنے کا اختیار۔ لوگوں کو یہ حق ملنا چاہیے۔ اگر یہ حق نہیں دیا جائے گا تو ایک منافق قوم وجود میں آجائے گی جس کے آئین پر اللہ کی حاکمیت کی بات درج ہوگی مگر جس کے حکمرانوں سے لے کر عوام اور جس کے دانشوروں سے لے کر مذہبی لیڈروں کی اکثریت اپنے اپنے مفادات، خواہشات اور تعصّبات کے پیرو ہوں گے۔ قارئین اگر برا نہ محسوس کریں تو دنیا کے نقشے پر نگاہ ڈالیں۔ انھیں ایسی قوم کو تلاش کرنے میں زیادہ مشکل نہیں ہوگی۔

دین کے اجتماعی احکام

یہاں کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ہم دین کے اجتماعی احکام کی نفی کر رہے ہیں۔ اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ جس طرح افراد کے لیے دین نے احکام دیے ہیں، ٹھیک ویسے ہی اس نے

سیاست اور سماج کے پہلو سے بھی بہت سے احکام دیے ہیں۔ جہاد، حدود، نماز، زکوٰۃ اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی ریاستی سطح پر ترویج اور ان جیسے اور بہت سے احکام ہیں جن کا تعلق ریاست سے ہے۔

تاہم سوال یہ ہے کہ دین کے اجتماعی احکام اللہ تعالیٰ نے کیا حکمرانوں کو مخاطب کر کے دیے ہیں یا وہ اس لیے دیے گئے ہیں کہ کچھ لوگ زبردستی اقتدار پر قبضہ کر کے ان احکام کو اپنے فہم کے مطابق لوگوں پر زبردستی ٹھونس دیں؟ حقیقت یہ ہے کہ احکام اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دیے ہی اس وقت تھے جب وہ حکمران بن چکے تھے۔ پھر اہم ترین بات یہ ہے کہ یہ احکام ان لوگوں کے لیے دیے گئے ہیں جنھوں نے پوری طرح ایمان کو سمجھ کر قبول کیا اور جو اپنی زندگی اللہ کی مرضی کے مطابق گزارنے کے لیے تیار ہیں۔ اسلام کے اجتماعی احکام ایسی رعایا کے حکمرانوں کو مخاطب کر کے دیے گئے ہیں۔ ان احکام کا کوئی تعلق اس بات سے نہیں کہ ایک اقلیتی گروہ اقتدار پر قبضہ کرے اور اپنے تصورات کو جنھیں وہ حق سمجھتا ہو اسے اکثریت پر نافذ کر دے۔

لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان احکام کو اجتماعی زندگی سے بالکل نکال کر پھینک دیا جائے اور ہم اپنے اجتماعی معاملات اللہ کو چھوڑ کر انسانوں کی مرضی کے مطابق چلائیں۔ ہمارا ہرگز یہ مدعا نہیں ہے۔ ہمارا یہ یقین ہے کہ اسلام کی شریعت جس طرح آخرت میں فلاح کی ضامن ہے وہ دنیا میں بھی کامیابی کا ذریعہ ہے۔ جس طرح افراد کے بارے میں اس کی رہنمائی بہترین نتائج دیتی ہے اسی طرح اجتماعی زندگی میں بھی اسلام کے قوانین ہی بے مثل ہیں۔ تاہم ان کو زندگی کا حصہ بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ اہل علم سماجی علوم اور دین میں گہرا تفقہ پیدا کر دیں۔ دین میں تفقہ تو خود قرآن مجید کا تقاضہ ہے اور سماجی علوم میں اس لیے کہ جدید سماج اپنے ارتقا کے بعد انتہائی پیچیدہ ہو چکا ہے۔ کم از کم اس کی مبادیات سے واقف ہونا لازمی ہے۔

اہل علم اور علماء کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عوام اور خواص دونوں کو دین کی تعلیم دیں، ان کے شبہات وسوالات کا جواب دیں، انھیں خدا کے حضور پیشی سے ڈرائیں اوران کو بتائیں کہ انہوں نے اللہ کی مرضی کے مطابق خود کو نہیں ڈھالا تو اس کے انتہائی بھیانک نتائج نکلیں گے۔ یہی اہل علم کے کرنے کا اصل کام ہے۔ علماء میں سے کچھ اگر یہ سمجھتے ہیں کہ ان میں نظام حکومت کو چلانے کی بہتر صلاحیت ہے۔ اور یہ کہ وہ دوسروں سے زیادہ بہتر انداز میں سیاست کے ذریعے سے دین کی خدمت کر سکتے ہیں تو ان کا حق ہے کہ خود کو عوام کے سامنے پیش کریں۔ جمہوری طریقے سے عوامی تائید سے منتخب ہو کر اقتدار حاصل کریں اور جو تبدیلیاں وہ لانا چاہتے ہیں وہ لائیں۔ تاہم اگر عوام کی اکثریت ہی اسلام کی اجتماعی سطح پر نفاذ کے قائل نہیں ہے تو ان پر بالجبر اسلام مسلط کرنے کے بجائے انہیں اس پر قائل کرنے کی کوشش کریں۔ یہی درست راستہ ہے۔

تاہم اس سب کے باجود اگر کسی کی یہ رائے ہے کہ عوامی خواہشات کے برخلاف کوئی چیز اپنی دانست میں حق سمجھ کر دوسروں پر اس کا مسلط کرنا درست ہے تو پھر ہمیں یہ سمجھادیں کہ اگر آج پاکستان کی کوئی اقلیت زبردستی اقتدار پر قبضہ کر کے اپنا نقطہ نظر سب پر نافذ کردے تو یہ کیسے غلط ہوگا۔ کیونکہ وہ تو اپنی بات کو حق ہی سمجھتے ہیں۔

بہرحال یہ سب بھی ہمارا نقطہ نظر ہے جسے ہم نے دلیل کے ساتھ پیش کر دیا۔ ماننا نہ ماننا لوگوں کا کام ہے۔ ہمارے نزدیک ختم نبوت کے بعد اب ایک ہی راستہ باقی ہے۔ دعوت اور انذار اور اپنا نقطہ نظر دلیل سے پیش کرنا۔ اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہا۔

جہاں رہیے بندگان خدا کے لیے رحمت بن کر رہیں، باعث زحمت نہ بنیے۔

> منفی انسان کو ہر موقع میں ایک مشکل نظر آتی ہے
> مثبت انسان ہر مشکل میں ایک موقع دیکھتا ہے (ابویحییٰ)

ابو یحییٰ

مضامین قرآن (26)

دلائل نبوت ورسالت: ذاتی زندگی اور سیرت رسول

ذاتی زندگی اور غیر معمولی سیرت

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو اس وقت آپ کی عمر مبارک چالیس برس تھی۔ چالیس برس کی یہ زندگی آپ نے کہیں اور نہیں یہیں اپنی قوم کے بیچ گزاری تھی۔ آپ اسی قوم کے مرکز ام القریٰ مکہ میں پیدا ہوئے۔ یہیں پلے بڑھے۔ جنگ و امن کے قبائلی معاملات میں حصہ لیا۔ تجارت کی۔ لوگوں کے ساتھ لین دین کے معاملات کیے۔ شادی کی اور بیوی بچوں کے ساتھ عائلی زندگی گزاری۔ چالیس برس قوم کے درمیان گزارنے کے بعد آپ نے اعلان نبوت کیا۔ جس کے بعد آپ کی دعوت کسی اجنبی کی صدا نہیں بلکہ ایک جانی پہچانی شخصیت کی پکار تھی۔

یہ پکار ایک ایسی ہستی کی تھی جسے لوگ خود صادق اور امین کہتے تھے۔ جس کے حسن خلق کے سب معترف تھے۔ جس کی غریب پروری اور انسانی ہمدردی کے سب گواہ تھے۔ آپ وہ ہستی تھے جس کا دامن نہ کبھی بت پرستی سے آلودہ ہوا، نہ شراب اور بدکاری کے قریب سے کبھی آپ گزرے۔ امانت، دیانت، سچ، ایفائے عہد جیسی اعلیٰ صفات آپ کی زندگی تھیں۔ آپ کی بیوی آپ کی سب سے بڑی مداح تھیں۔ آپ کے دوست آپ کے سب سے بڑے ثنا خواں تھے۔ آپ کے غلام نبوت سے پہلے بھی آپ کی غلامی کو آزادی پر ترجیح دیتے۔

اس پاکیزہ اور اعلیٰ ہستی نے جب ایمان کی صدا بلند کی تو سب سے پہلے آپ کے قریبی لوگ

اور رفقاء آپ پر ایمان لے آئے۔ ان میں آپ کی اہلیہ حضرت خدیجہ، آپ کے قریبی دوست حضرت ابوبکر، خادم حضرت زید اور بیٹوں کی طرح ساتھ رہنے والے حضرت علی کا نام نمایاں ہے۔ ان تمام قریبی لوگوں کے ایمان لانے کی وجہ ایک طرف تو یہ تھی کہ آپ کی دعوت عقل و فطرت کے مسلمہ تقاضوں کے عین مطابق تھی۔ مگر اس کے ساتھ دوسری اہم تر بات یہ تھی کہ جو ہستی یہ دعوت پیش کر رہی تھی اس کی زندگی سیرت و کردار کا اعلیٰ ترین نمونہ تھی۔ ان تمام لوگوں کے لیے یہ بات ناقابل تصور تھی کہ آپ معاذ اللہ کوئی بات غلط کہیں۔ یہ معاملہ آپ کے قریبی لوگوں ہی کا نہیں تھا بلکہ تمام لوگوں کے نزدیک اعلان نبوت سے قبل ہی آپ صادق اور امین تھے اور یہ خطاب دوسرے لوگوں ہی نے آپ کو دیا تھا۔ آپ کی یہی سیرت آپ کی سچائی کا پہلا ثبوت تھی۔ اسی بنا پر لوگ آپ کی بات سننے پر مجبور ہوئے۔ ایک ایک کر کے لوگوں کی آنکھوں سے پردے اٹھتے گئے اور آخر کار سب لوگ آپ پر ایمان لے آئے۔

بخاری و مسلم میں یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ ابتدائے نبوت میں ایک روز کوہ صفا پر چڑھ کر آپ نے تمام قریش کو پکارا اور جب سب جمع ہو گئے تو ان سے دریافت کیا کہ اگر میں تم کو یہ خبر دوں کہ پہاڑ کے پیچھے شہسواروں کی ایک جماعت تم پر حملہ کرنا چاہتی ہے تو کیا تم مجھے سچا مانو گے؟ لوگوں نے کہا کہ ہم نے آپ سے سچ ہی کا تجربہ کیا ہے۔ اس پر آپ نے اپنی دعوت ان کو دیتے ہوئے فرمایا کہ میں ایک سخت عذاب سے قبل تم کو خبردار کرنے بھیجا گیا ہوں۔ جس پر ابولہب نے آپ کو برا بھلا کہا۔

قریش کے لوگ آپ کے اسی سیرت و کردار کی بنیاد پر آپ سے متاثر ہو جاتے تھے۔ گرچہ عرب کے سرداروں نے ابتدا میں آپ کی مخالفت کی، مگر آپ کی دعوت کی ابتدا سے انتہا تک ہر مخالف کے ذہن میں یہی بات تھی کہ جو شخص بندوں کے معاملے میں جھوٹ نہیں بول سکتا وہ خدا

کے معاملے میں جھوٹ کیوں بولے گا۔اس سوال کا جواب کسی کے پاس نہ تھا۔

نبی اُمی کی ذاتی زندگی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و زندگی کا ایک دوسرا پہلو یہ تھا جس سے تمام مخاطبین واقف تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے قبل کی اپنی تمام زندگی کسی شاعر، عالم، مذہبی یا سیاسی لیڈر کے طور پر نہیں گزاری۔آپ نے جو کلام پیش کیا اس نے تمام عربوں کو لاجواب کر ڈالا۔مگر حال یہ تھا کہ آپ کو شعر کا کبھی ذوق رہا نہ اشعار کبھی یاد ہوا کرتے تھے۔نہ آپ نے زندگی میں کوئی دیوان لکھا نہ قصیدہ کہا۔نہ کبھی تُک بندی کی نہ سخن سازی کی کسی مشق کا شوق کبھی پیدا ہوا۔مگر ایک روز اچانک آپ نے خدا کے نام پر ایک کلام پیش کرنا شروع کیا جس کی مثال اور نظیر پیش کرنے سے سارا عرب قاصر ہوگیا۔ ایک عام آدمی نے یہ معجزہ کیسے کر دیا،اس کا جواب کسی مخالف کے پاس نہیں تھا۔

پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آپ کا تعلق ایک اُمی قوم سے تھا۔یعنی عرب کے اسماعیلی جن کے ہاں دو ڈھائی ہزار برس سے کوئی نبی یا رسول نہیں آیا تھا۔کوئی الہامی کتاب موجود تھی نہ نبیوں کے صحائف ہی پڑھے پڑھائے جاتے تھے۔مذہبی علم کی جو کچھ روایت تھی وہ یہود و نصاریٰ کے پاس تھی۔ان کے ہاں بھی صرف علماء اور فقیہہ ہی مذہبی کتب اور تاریخ کے امین تھے۔عام لوگوں کی پہنچ کتابوں تک نہیں تھی۔یہ پرنٹنگ پریس کا دور نہیں تھا کہ کتابیں بازاروں میں عام بکتی اور گھروں میں رکھی جاتی ہوں۔مذہبی ادب ہی نہیں عام لکھنے پڑھنے کی روایت بھی عربوں کے ہاں نہیں تھیں۔عام عربوں کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے۔

مگر ایک روز آپ خدا کے نام پر گفتگو شروع کرتے ہیں۔اس کے بعد انبیا کی تاریخ کا کون سا واقعہ ہے جو زیر بحث نہیں آجاتا۔آدم علیہ السلام سے لے کر نوح علیہ السلام اور ابراہیم علیہ

السلام سے لے کر عیسیٰ علیہ السلام اور پھر ان کے بعد والوں کی بھی زندگی، تاریخ، دعوت اور زمانے کے واقعات اور مکالمات ایسے بیان ہوتے ہیں جیسے کوئی سامنے بیٹھا یہ سب کچھ دیکھ رہا ہو۔ جو قریش اور یہود و نصاریٰ کی پوری قیادت کے علم میں نہیں تھا، وہ بھی بیان ہوا۔ جو ان کے علم میں تھا اور کسی اور کے علم میں نہیں تھا، اس کو بھی کھول کر رکھ دیا گیا۔ جو وہ بیان کرتے تھے اور غلط کرتے تھے، اس کی بھی تصحیح کر دی گئی۔

سوال یہ ہے کہ مکہ کا ایک چالیس سالہ تاجر جس کی زندگی میں لکھنے پڑھنے کا کوئی گزر ہی نہیں، جو کبھی علما کے پاس بیٹھا نہ پیشواؤں کے در پر حاضر ہوا، وہ اچانک اس طرح کی گفتگو کیسے شروع کر سکتا ہے۔ یہ سوال اتنا فطری تھا کہ ہر شخص یہ سوال اٹھا تھا۔ جس پر عرب کے سرداروں نے لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے یہ شوشہ چھوڑا کہ کچھ عجمی غلام ہیں جو آ کر آپ کو قصے کہانیاں سناتے ہیں اور آپ اسے بیان کر دیتے ہیں۔ مگر قرآن یہ سوال کرتا ہے کہ کوئی عجمی غلام فصیح عربی میں یہ واقعات کیسے بیان کر سکتا ہے۔ چلو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے واقعات کہیں سے سن بھی لیے تو ان واقعات کی وہ تفصیل کہاں سے بیان ہو سکتی ہے جو صرف یہودی علما جانتے ہیں۔ یہود نے امتحان لینا چاہا۔ ان قصوں کی حقیقت جاننا چاہی جو ان کے چند علماء کے سوا کسی کے علم میں نہیں تھے۔ ان کے سجھانے پر قریش نے سوال پوچھنا شروع کیے۔ یوسف اور بنی اسرائیل فلسطین سے مصر کیسے پہنچے؟ ذوالقرنین کون تھا؟ اصحاب کہف کون تھے؟

ان سوالات کا جواب قرآن مجید نے دیا۔ اس طرح دیا کہ ہر شخص انگشت بدنداں رہ گیا۔ واقعات کو اتنی تفصیل سے بیان کیا گیا کہ لوگ حیران رہ گئے۔ قرآن مجید میں نہ صرف یہ واقعات تفصیل سے بیان ہوتے ہیں بلکہ جو تاریخی غلطیاں یہود نے کی ہیں اور جو خود ان کے علم میں بھی نہیں تھیں کہ یہ چیزیں بائبل ہی میں غلط لکھی ہوئی ہے اس کی بھی تصحیح کر دی جاتی ہے۔ مثلاً حضرت

یوسف کے قصے میں بائبل بیان کرتی ہے کہ اس زمانے میں وہاں فرعون حکمران تھا۔ جبکہ تاریخی طور پر یہ ایک غلطی ہے۔ اس دور میں وہاں عرب ہکساس یا چرواہے بادشاہ حکمران تھے۔ جن کا لقب فرعون نہ تھا۔ چنانچہ قرآن اس واقعے میں بادشا مصر کے لیے فرعون کا لفظ استعمال کرنے کے بجائے عزیز کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ جبکہ حضرت موسیٰ کے واقعے میں فرعون کا لفظ ہی استعمال کیا جاتا ہے۔

ایک طرف آپ کے علم غیب کا یہ حال تھا۔ دوسری طرف قرآن مجید بار بار لوگوں کو متوجہ کرتا ہے کہ نبوت کے اس دائرے سے باہر آپ اپنی ذات کے لیے غیب کا کوئی ایسا علم نہیں رکھتے جس سے کوئی ذاتی منفعت حاصل کر لی جائے یا آپ کسی نقصان سے بچ سکیں۔ اگر کوئی شخص کسی طرح غیب کے علم اور معلومات پر متوجہ ہو جائے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ ایک دائرے میں غیر معمولی علم کا مظاہرہ کر رہا ہو اور اپنی ذات کی حد تک یہ علم غیب اسے نہ کوئی نفع دے رہا ہو اور نہ کسی نقصان ہی سے بچا رہا ہو۔ مگر آپ کے معاملے میں یہ عجیب وغریب واقعہ ظہور پذیر ہوا کہ نبوت کے پہلو سے آپ ہر چیز بتا رہے ہیں اور عام آدمی کے پہلو سے اپنے نفع نقصان سے متعلق غیب کا علم نہیں رکھتے۔

ان سب کی توجیہ اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے کہ آپ اللہ کے سچے نبی تھے جن پر وحی اترتی تھی۔ یہ صرف اسی وقت ممکن ہے جب اللہ نے اس اعلیٰ انسان کو نبوت ورسالت کے منصب کے لیے چن لیا ہو۔ جبرائیل کو وحی دے کر بھیجا اور اس کی زبانِ حق ترجمان پر قرآن کو جاری کر دیا۔ اس کے بغیر یہ ممکن ہی نہیں۔ چنانچہ حضور کی بے مثل سیرت اور آپ کی زندگی اس بات پر گواہ ہے کہ آپ ایک سچے نبی ہیں اور آپ پر اترنے والا کلام اللہ کا کلام ہے۔

قرآنی بیانات

’’کہہ دو اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو نہ میں اس کو تمھیں سناتا اور نہ وہ اس سے تمھیں باخبر کرتا۔ میں اس سے پہلے تم میں ایک عمر بسر کر چکا ہوں تو کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔‘‘
(یونس10 :16)

’’اور تم تو اس سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے اور نہ اس کو اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ ایسا ہوتا تو یہ جھٹلانے والے مین میکھ نکالتے۔‘‘ (عنکبوت29 :48)

’’جن لوگوں نے نبی کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ یہ فرقان (قرآن) ایک من گھڑت چیز ہے جسے اس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اس کام میں اس کی مدد کی ہے۔ بڑا ظلم اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔‘‘ (فرقان25 :5-4)

’’اور ہمیں اچھی طرح علم ہے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس کو تو ایک انسان سکھاتا ہے۔ اس شخص کی زبان جس کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں عجمی ہے اور یہ فصیح عربی زبان ہے۔‘‘(نحل16 :103)

’’اور ہم نے اس (پیغمبر) کو شعر کی تعلیم نہیں دی ہے اور یہ اس کے شایان شان بھی نہیں۔ یہ تو بس یاددہانی اور نہایت واضح قرآن ہے۔‘‘، (یٰسین36 :69)

’’کہہ دو، میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع و نقصان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا، مگر جو اللہ چاہے اور اگر میں غیب جانتا ہوتا تو خیر کا بڑا خزانہ جمع کر لیتا اور مجھے کوئی گزند نہ پہنچ پاتا۔ میں تو بس ان لوگوں کے لیے ایک ہوشیار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں جو ایمان لائیں۔‘‘
(اعراف7 :188)

Eric Metaxas

ترجمہ: ہادریہ روزی

سائنس خدا کا مقدمہ ثابت کرتی ہے

سن 1966ء میں ٹائمز نامی رسالے میں ''کیا خدا مردہ ہے؟'' کے عنوان سے ایک آرٹیکل شائع ہوا۔ اس کے نتیجے میں زیادہ تر لوگوں کا ماننا تھا کہ خدا کا تصور اب دقیانوسی ہو چکا ہے۔ کیونکہ سائنس کی ترقی کے بعد اب کائنات کی توجیہہ کے لیے خدا کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اس کے باوجود آج جہاں سے خدا کی موجودگی کے شواہد مل رہے ہیں وہ کوئی اور شعبہ نہیں بلکہ خود سائنس ہی ہے۔

کہانی کچھ یوں ہے کہ جب ٹائمز نے یہ مضمون شائع کیا، اسی سال مشہور ماہرِ فلکیات کارل ساگان نے یہ تھیوری پیش کی کہ کسی سیارے پر زندگی موجود ہونے کے لیے دو باتیں ہونا لازمی ہیں:

ا۔ ایک ستارے کا موجود ہونا

۲۔ اور ایک سیارے کا اُس ستارے سے خصوصی فاصلے پر موجود ہونا

اس حساب سے کائنات کے لگ بھگ دس ارب سنکھ (octillion) یعنی ($1x10^{27}$) سیاروں میں سے دس ارب دس نیلم (septillion) یعنی ($1x10^{24}$) سیاروں پر زندگی کے آثار پائے جانے چاہئیں۔ اس تھیوری نے سائنسدانوں کی امیدوں کو تقویت بخشی اور وہ ایک وسیع ٹیلی سکوپ نیٹ ورک کے ذریعے خلاء سے موصول ہونے والے کسی سگنل کا انتظار کرنے لگے۔ برسوں بیت گئے مگر یہ خاموشی نہ ٹوٹی البتہ امیدیں ٹوٹ گئیں۔ اور پھر نئی تحقیق نے یہ ثابت کر دیا کہ زندگی کی موجودگی محض اُن دو اصولوں پر منحصر نہیں بلکہ ایسے بیسیوں اور اصول ہیں جن پر

پورا اتر کر ہی کوئی سیارہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہاں زندہ رہنا ممکن ہو۔ یوں سائنسدانوں کے نظریاتی حیات بخش سیاروں کی تعداد گھٹتی چلی گئی۔ گھٹتے گھٹتے تعداد صفر تک پہنچ گئی۔ شواہد سے ثابت ہو گیا کہ اس قاتل کائنات میں زندگی کی کوئی رمق باقی رہنا ناممکن سی بات ہے۔ یہاں تک کہ ہماری زمین پر بھی اس کا امکان صفر ہی ہے۔

آج کسی سیارے پر زندگی کی موجودگی کی شرائط 200 سے اوپر جا پہنچی ہیں۔ جن میں سے ایک شرط پر بھی اگر سیارہ پورا نہ اترے تو تمام سسٹم ہی تباہ ہو جائے گا اور زندگی باقی نہ رہے گی۔ اس سب کے باوجود ہم اسی کائنات میں زندہ ہیں۔ نہ صرف زندہ ہیں بلکہ بڑے آرام سے زندگی کے متعلق گفتگو کر رہے ہیں۔ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا وہ تمام شرائط ایک حادثے کے نتیجے میں اتنے بہترین انداز میں پوری ہو گئیں؟ اندھے مادے کے فلسفے سے اتفاق کہاں کا انصاف ہے؟ کیا ایک بے انتہا ذہین سُپر پاور کی موجودگی کو تسلیم کرنا زیادہ بہتر آپشن نہیں، جس نے ان ناقابلِ تصور عوامل کی بہ یک وقت موجودگی کو یقینی بنایا تاکہ ایک مکمل حیات بخش نظام عمل میں آسکے؟

مزید حیران کن بات یہ ہے کہ پوری کائنات کو وجود میں لانے جیسے معجزے کے مقابلے میں، کسی ایک سیارے کو قابلِ حیات بنانے کے لیے اس کے نوک پلک سنوارنے کا عمل تو کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ کائنات کے قائم و دائم رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ چار قسم کی قوتیں ؛ کششِ ثقل (Gravity)، برقی مقناطیسی قوت (Electromagnetic force)، طاقتور اور کمزور نیوکلیائی قوتیں (Strong and weak nuclear forces) ایک مخصوص تناسب کے ساتھ موجود ہوں۔ یہ تناسب بالکل قطعی (Exact) ہونا چاہیے کیونکہ اگر کسی ایک عنصر کی معمولی سی کمی یا زیادتی ہو جائے تو کائنات کا وجود میں آنا ممکن نہیں رہتا۔ مثال کے طور پر اگر کائنات میں نیوکلیائی قوتوں (Nuclear forces) اور برقی مقناطیسی

قوتوں(Electromagnetic forces)کا تناسب(ratio) 0.0000001 کے معمولی ترین درجے میں بھی متغیر(vary) ہوجائے تو ایک ستارے کا وجود بھی ناممکن ہو جاتا ہے۔ یہ تو ہوئی ایک اصول کی بات، ایسے ہزاروں دوسرے معیار اور شرائط ہیں جن کا متعین تناسب میں پورا ہونا اتنا پیچیدہ عمل ہے کہ کائنات کا خود بخود وجود میں آنے والا فلسفہ عقل وفہم سے ماوراہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کسی سکے کو دس ہزار سے زائد مرتبہ اچھالنے پر بھی ہر بار ایک ہی نتیجہ نکلتا رہے۔

فریڈ ہوئل نامی ماہرِ فلکیات کا کہنا ہے کہ ان انکشافات پر اس کا الحادی نظریہ دھرا کا دھرارہ گیا۔مزید یہ کہ عقلِ عام یہ کہتی ہے کہ ان تمام حقائق کی روشنی میں معلوم ہوتا ہے کہ کسی مہاذہین(Supreme) طاقت نے کیمیا(chemistry)، حیاتیات(biology)اور طبعیات(physics)کے اصولوں کے ساتھ کھیل کھیلا ہے۔اس کا کوئی جواب نہیں۔آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر جان لیناکس کہتے ہیں کہ ہماری کائنات کے متعلق ہمارا علم جتنا وسیع ہوتا جائے گا، ایک خدا پر یقین اتنا ہی پختہ ہوتا جائے گا۔ کیونکہ یہی وضاحت ہے جو کائنات اور ہمارے وجود کے متعلق ہمارے ہر سوال کا جواب ہے۔

ہمیں یہ مان لینا چاہیے کہ ہماری کائنات سب معجزوں سے بڑا معجزہ ہے۔ اور اس ادراک کے بعد، یہ بات بھی روزِ روشن کی طرح عیاں ہوجاتی ہے کہ یہاں کا ہر ستارہ، ہر سیارہ، ہر سورج اپنی پوری آب وتاب سے ایک عظیم طاقت کی جانب اشارہ کرتا ہے، جو ان سب قوتوں سے کہیں آگے ہے۔

مبشر نذیر

ترکی کا سفرنامہ (29)

اس کے بعد سے لے کر اب تک AKP کی حکومت ہے۔ مذہبی ترکوں کی اس جدوجہد میں ہمارے ملک کی مذہبی جماعتوں کے لئے کچھ سبق موجود ہیں۔

سب سے پہلا سبق تو یہ کہ کوئی بھی سیاسی جماعت عوام کی حمایت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہماری مذہبی اور غیر مذہبی سیاسی جماعتوں نے کبھی عوام کے اصل مسائل کو اپنا موضوع نہیں بنایا۔ عوام کا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے کہ آئین میں کیا تبدیلیاں کی جائیں؟ اختیارات صدر کے پاس ہوں یا وزیر اعظم کے؟ عوام کا اصل مسئلہ کرپشن، مہنگائی، بجلی کی فراہمی اور بے روزگاری کا خاتمہ ہے۔ تعلیم اور صحت کی سہولیات فراہم کرنا ان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اس طریقے پر عمل کر کے ترکی کی اسلام پسند جماعتوں نے کامیابی حاصل کی ہے۔ اگر ہماری مذہبی جماعتیں واقعتاً دین اور ملک سے مخلص ہیں تو انہیں بھی یہی روش اختیار کرنی چاہیے۔

لیکن افسوس کہ ہماری مذہبی جماعتوں کا تصور مختلف ہے۔ ان کے خیال میں چونکہ وہ دین کا نام استعمال کرتے ہیں، اس وجہ سے تمام مسلمانوں کا یہ دینی فریضہ ہے کہ وہ انہیں ووٹ دیں۔ جو انہیں ووٹ نہیں ڈالتا، وہ دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے یا کم از کم انتہائی گناہ گار ہوتا ہے۔ پچھلے الیکشن میں ایک صاحب نے تو یہ فتوی جاری کیا کہ ان کا انتخابی نشان ''کتاب'' قرآن مجید ہے۔ جو اسے ووٹ نہیں دے گا، اس کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔ لیکن لوگوں نے اس فتوے کو کوئی اہمیت نہ دی۔ اسلام میں سیاست عوام کی خدمت کا نام ہے۔ جو عوام کی خدمت میں جتنا مخلص ہو گا، اس کی سیاست اتنا ہی اسلام کے قریب ہو گی۔

اس جدوجہد میں دوسرا سبق یہ ملتا ہے کہ مذہبی حضرات کو سیکولر لوگوں کی نسبت بہتر اخلاق اور

کردار کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ترکی کی سیاست میں سیکولر سیاست دان کرپشن اور بددیانتی کا نشان بن کررہ گئے تھے۔ مذہبی سیاست دانوں نے اچھے کردار کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے انہیں عوام کی حمایت حاصل ہوئی۔ بدقسمتی سے ہمارے مذہبی اور سیکولر سیاستدان کرپشن میں ایک دوسرے کا مقابلہ کررہے ہیں۔

ترکی کے مذہبی سیاستدانوں کی جدوجہد کا تیسرا سبق یہ ہے کہ پوری تیاری کے بغیر طاقتور سے ٹکرانے کے نتیجے میں نقصان اپنا ہی ہوتا ہے۔ترکی کی فوج اور اشرافیہ میں سیکولرازم کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ یہاں کے مذہبی سیاست دانوں نے متعدد بار سیکولر فاشزم کا براہ راست مقابلہ کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں انہیں پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہمارے ہاں بھی یہی معاملہ رہا ہے۔موجودہ حکومت نے اس ضمن میں بڑی مناسب حکمت عملی اختیار کررکھی ہے۔اس کی بجائے اگر ہمارے راہنما پوری توجہ اپنی تعمیر پر دیں تو کچھ ہی عرصے میں وہ اس مقام پر آسکتے ہیں جہاں وہ کوئی مثبت کردار ادا کرسکیں۔

ترکی میں سیکولر فاشزم کے ذریعے مذہب کو محدود کرنے کی بے پناہ کوشش کے باوجود یہاں مذہب کس درجے میں موجود ہے، اس کے بارے میں اسلام کے مشہور ناقد، لیوس برنارڈ کا یہ تبصرہ قابل غور ہے:

اسلام کی جڑیں ترکی کے عوام میں بہت گہری ہیں۔اپنی ابتدا سے لے کر زوال تک سلطنت عثمانیہ اسلام کے پرچار یا دفاع سے وابستہ رہی ہے۔۔۔ ویسٹرنائزیشن کی ایک صدی کے دوران، ترکی میں ایسی بڑی بڑی تبدیلیاں آئی ہیں جن کے بارے میں ایک باہر کا شخص سوچ بھی نہیں سکتا مگر اسلام کی جڑیں ترکوں کی زندگی اور ثقافت میں زندہ ہیں اور ترک مسلم کی شناخت کو اب بھی چیلنج نہیں کیا جاسکتا۔(The Emergence of Modern Turkey)

سامسن، ترابزن اور یوزن گولو

سامسن بلیک سی پر واقع ترکی کی بڑی بندرگاہ ہے۔ یہ دو دریاؤں " کی زی لرمارک" یا سرخ دریا اور "یی زی لرمارک" یا سبز دریا کے درمیان کے ڈیلٹا میں واقع ہے۔ یونانی دیو مالا کے مطابق سامسن، امیزان (Amazons) کی فوج کا علاقہ ہے۔ یہ خواتین پر مشتمل فوج تھی جنہیں کڑی جنگی تربیت دی جاتی اور کمان چلانے کے لئے ان کی ایک چھاتی کاٹ دی جاتی۔ بہرحال یہ کوئی تاریخی حقیقت نہیں بلکہ محض دیو مالا ہی تھی۔ سامسن میں ترکی کی گیس کی تنصیبات ہیں۔ یوکرائن سے بحیرہ اسود کے نیچے سے ایک گیس پائپ لائن سامسن آکر نکلتی ہے۔

ہم لوگ رات کے اندھیرے میں سامسن پہنچے تھے۔ اس وجہ سے شہر کے بارے میں کوئی رائے قائم نہ کر سکے۔ کچھ دیر ہوٹل تلاش کرنے میں لگ گئی۔ ایک ہوٹل ملا جو کہ کافی مہنگا محسوس ہوا۔ قریب ہی ایک صاحب کھڑے تھے۔ میں نے ان سے ہوٹل کے بارے میں پوچھا۔ بولے، " آپ کو عربی آتی ہے۔" اس کے بعد کہنے لگے، " میں ٹیکسی چلاتا ہوں۔ آپ کو ہوٹل چھوڑ دیتا ہوں۔" ہم ان کے پیچھے روانہ ہوئے۔ یہ ہمیں ایک ہوٹل میں لے آئے جو کہ اسٹینڈرڈ کے اعتبار سے کوئی خاص نہ تھا مگر کرایہ زیادہ تھا کیونکہ ہوٹل والے نے ٹیکسی والے کو کمیشن بھی ادا کرنا تھا۔ کچھ بحث و تمحیص کے بعد 70 لیرا پر معاملہ طے پایا۔

کمرے میں سامان رکھ کر میں کھانا خریدنے نکلا۔ ترکی کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ ان کے شہر بہت جلدی بند ہو جاتے تھے۔ ابھی ساڑھے نو بجے تھے مگر شہر میں ہو کا عالم تھا۔ کھانے کے چند ایک ہوٹل کھلے تھے۔ میں ایک ہوٹل میں داخل ہوا۔ یہاں مختلف تھالوں میں کچھ ڈشیں پڑی ہوئی تھیں۔ یہاں چپاتی بھی دستیاب تھی۔ میں نے اس کا نام بھی پوچھ لیا تا کہ آئندہ آسانی ہو۔ معلوم ہوا کہ اسے "لَوَش" کہتے ہیں۔ میں نے مکس سبزی کی ایک ڈش پیک کروائی اور واپس

کمرے میں آ گیا۔

ڈرتے ڈرتے کھانا چکھا تو قابل برداشت محسوس ہوا۔ کھانا کھا کر ہم جلد ہی سو گئے۔ ناشتہ کمرے کے کرائے میں شامل تھا۔ صبح اٹھ کر ناشتے کے لئے پہنچے تو وہی لکڑی کے بن اور ان کے ساتھ شہد، پنیر اور مکھن تھا۔ ہوٹل میں انٹرنیٹ کی سہولت بھی دستیاب تھی۔ میں نے وائرلیس کے ذریعے اپنے لیپ ٹاپ پر انٹرنیٹ لگا کر ای میلز چیک کیں اور پاکستانی اخبارات کا مطالعہ کیا۔ اخبارات میں پاکستان سے متعلق ایک ہولناک خبر ہمارے سامنے تھی۔

بعض انتہا پسندوں نے گوجرہ میں ایک عیسائی بستی کو آگ لگا دی تھی جس میں بہت سے افراد جل کر جان بحق ہو گئے تھے۔ اس شرم ناک کاروائی کے لئے بہانہ توہین رسالت کو بنایا گیا تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ ہم رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام پر ایسی کارروائیاں کر رہے ہیں کہ جن کے نتیجے میں اسلام بدنام ہو۔ اگر کسی جاہل نے توہین رسالت کا ارتکاب کیا بھی ہو تو اسے سزا دینے کے لئے ملک میں قانون موجود ہے۔ قانون کو ہاتھ میں لیتے ہوئے خود کارروائی کرنا اور بے گناہ افراد کو جلا کر ہلاک کر دینا ایسا جرم ہے جس کی کوئی گنجائش نہ اسلام میں موجود ہے اور نہ ہی کسی اخلاقی ضابطے میں۔ مجھے یقین ہے کہ ان مجرموں کے خلاف قیامت کے دن خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دعویٰ دائر کریں گے کیونکہ یہ لوگ آپ کے مقدس نام پر انسانیت کے خلاف ظلم کر رہے ہیں۔

جب آپ کو ہر شخص سے شکایت ہونے لگے
تو دیکھ لیجیے کہ خرابی کہیں آپ ہی کے اندر تو نہیں (ابویحییٰ)

پروین سلطانہ حنا

غزل

جب میرے دل میں اس کی محبت سما گئی
خود آگہی کا مجھ کو قرینہ سکھا گئی

عکسِ رخِ جمال کا مظہر ہے کائنات
اک نور کی کرن ہے کہ دنیا پہ چھا گئی

دن بھر کی دوڑ دھوپ سے تھکنے لگا بدن
لیکن سکوتِ شب میں مجھے نیند آ گئی

کچھ لوگ دوسروں کو جلاتے رہے مگر
دیکھا تو آگ ان کے ہی دامن پہ آ گئی

اپنوں سے کوئی کرتا ہے ایسا سلوک بھی
تیری یہ بے رخی تو میرا دل دکھا گئی

شکوہ کبھی کسی سے تو میں نے کیا نہیں
یہ آج کیسی بات میرے لب پہ آ گئی

لوح و قلم کا ورثہ مجھے دین سے ملا
پیغامِ حق کی بات صحیفوں میں آ گئی

رنگِ حناؔ بھی اس کے ہی رنگوں کا عکس ہے
حسنِ ازل کی خوشبو گلابوں میں آگئی

ابویحییٰ کی کتابیں

آخری جنگ

شیطان کے خلاف انسان کا اعلان جنگ

حکمت کی باتیں

حکمت کی وہ باتیں جو دنیا و آخرت میں کامیابی کی ضامن ہیں

ملاقات

اہم علمی، اصلاحی، اجتماعی معاملات پر ابویحییٰ کی ایک نئی فکر انگیز کتاب

کھول آنکھ زمین دیکھ

مغرب اور مشرق کے سات اہم ممالک کا سفرنامہ

جب زندگی شروع ہوگی

ایک تحریر جو ہدایت کی عالمی تحریک بن چکی ہے

قسم اس وقت کی

ابویحییٰ کی شہرہ آفاق کتاب ''جب زندگی شروع ہوگی'' کا دوسرا حصہ

مسلمانوں کے باہمی حقوق

''مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرادیا کرو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔

آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو،

اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہ ظالم ہیں۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔

تجسس نہ کرو۔

اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے۔ کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو، تم خود اس سے گھن کھاتے ہو۔ اللہ سے ڈرو، بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔''

(الحجرات10-12:49)